قد افلح من تزکّی و ذکر اسم ربّہ فصلّی

وہ فلاح پا گیا جس نے تزکیہ کر لیا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پھر نماز کا پابند ہو گیا۔

1/96

ماہنامہ

المرشد

لاہور

تصوف کیا نہیں

تصوف کے لیے نہ کشف و کرامات شرط ہے نہ دنیا کے کاروبار میں ترقی دلانے کا نام تصوف ہے۔ نہ تعویذ گنڈوں کا نام ہے۔ نہ جھاڑ پھونک سے بیماری دور کرنے کا نام تصوف ہے۔ نہ مقدمات جیتنے کا نام تصوف ہے۔ نہ قبروں پر سجدہ کرنے، ان پر چادریں چڑھانے اور چراغ جلانے کا نام تصوف ہے اور نہ آنے والے واقعات کی خبر دینے کا نام تصوف ہے۔ نہ اولیاء اللہ کو غیبی ندا کرنا، مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا تصوف ہے۔ نہ اس میں ٹھیکیداری ہے کہ پیر کی ایک توجہ سے مرید کی پوری اصلاح ہو جائے گی اور سلوک کی دولت بغیر مجاہدہ اور بدون اتباع سنت حاصل ہو جائے گی۔ نہ اس میں کشف و الہام کا صحیح اترنا لازمی ہے اور نہ وجد و تواجد اور رقص و سرود کا نام تصوف ہے۔ یہ سب چیزیں تصوف کا لازمہ بلکہ عین تصوف سمجھی جاتی ہیں حالانکہ ان میں سے کسی ایک چیز پر تصوف اسلامی کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ یہ ساری خرافات اسلامی تصوف کی عین ضد ہیں۔ (دلائل السلوک)

اویسیہ سوسائٹی کالج روڈ ٹاؤن شپ لاہور

و قل رب زد نی علما ○

(اور کہو : اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما) (القران ۱۱۴ : ۲۰)

اس صدی کے مسلمان کے ساتھ یہ ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہے کہ اسے حصول علم سے محروم رکھا گیا اور رکھا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسناد اور ڈگریوں کی تقسیم کی بھر مار ہے۔ لیکن یہ ڈگریاں اور اسناد علم سے بالکل خالی' صرف تلاش معاش کے پروانے ہیں۔ اس ملک کے جو ادارے یہ پروانے تقسیم کرتے ہیں ان کا تعلیمی سلیبس' تربیتی پروگرام' طریقہ تدریس اور ماحول اس معیار کا ہی نہیں کہ وہ سکالر' مفکر' سائنسدان' محقق اور موجد پیدا کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قوم اس معاملے میں مکمل بانجھ ہے اور جو معاشرہ ایسے افراد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو وہ قوم اقتصادی' سیاسی' معاشرتی' تہذیبی اور دینی ترقی کی اہلیت سے ہی محروم رہتی ہے اور مسلسل ٹوٹ پھوٹ' زوال' بدحالی اور انار کی کاشکار رہتی ہے۔ مذہبی مدرسے تو دس قدم اور پیچھے ہیں جو دستار بند مولویوں کے کثیر پیداواری کار خانے تو ضرور ہیں لیکن وہ بھی چندہ اکٹھا کرنے' کفر کے فتوے لگانے' فرقے بنانے' فرقوں کو مزید گروہ اور گروپوں میں تقسیم کرنے والوں کے سوا معاشرے کو کچھ نہیں دے سکتے۔ جب سے انگریز سرکار نے ان درسگاہوں کو علم سے محروم کر کے ایک محدود اور جامد قسم کا سلیبس دے دیا تھا یہ ادارے آج تک اسے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اس کے علاوہ باقی تمام علوم شیطانی اور ان کا حصول کفر ہے۔

باقی دنیا کے مسلمانوں کو چھوڑیئے اس وطن سے تقسیم کے وقت 35 فیصد ایسے لوگ موجود تھے جو پڑھے لکھے شمار ہوئے تھے۔ آج نصف صدی بعد آبادی کا بہ مشکل 12 فیصد کو پڑھا لکھا شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں انگوٹھا چھاپ پڑھے کتنے ہیں واللہ اعلم۔

علم کے ساتھ ہم پاکستانی مسلمانوں کا رویہ ایسا ہی ہے تو پھر اگر حکمران مذہبی مدرسوں کی تالہ بندی کرتے ہیں اور یونیورسٹیوں کے گرانٹس ختم یا کم کرتے ہیں تو واویلا کرنے سے قوم کو کیا حاصل ہو گا؟ بے مقصد اداروں کا وجود باقی رہے یا نہ رہے۔ قوم کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

تاج رحیم

نزول قرآن کا مقصد

مولانا محمد اکرم اعوان

اللہ جل شانہ نے اپنے احسانات' اپنے کرم اور اپنی مہربانیوں کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا تَبٰرَکَ الَّذِیْ۔ بہت سی بابرکت ہے وہ ذات جس کے احسانات میں سے بہت بڑا احسان یہ ہے۔ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ اپنے نبی' اپنے رسول' اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر الفرقان کو نازل فرمایا۔ علیٰ عبدہ۔ اپنے بندے ۔ عبد دیگر عبدہ چیزے دیگر

بندہ ہونا الگ بات ہے اور کسی ہستی کے لئے اللہ کا یہ فرمانا کہ یہ میرا بندہ ہے یہ ایک بالکل ہی الگ بات ہے بندے کا کہنا کہ اللہ میرا رب ہے۔ حق ہے۔ بڑی بات ہے۔ لیکن کسی بندے کے لئے اللہ رب العزت کا یہ ارشاد فرمانا کہ یہ میرا بندہ ہے۔ یہ کسی بندے کے لئے عظمت کا آخری مقام ہے۔ اور قرآن حکیم نے یہ عظمت صرف اور صرف آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں بیان فرمائی ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ اَشْھَدُاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ عبدیت رسالت سے پہلے مذکورہ ہوئی کیونکہ بندے کے لئے سب سے اعلیٰ مقام مقام بندگی ہے اور اس میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی شریک نہیں۔ فرمایا اتنے عظیم محبوب' رسول اپنے بندے صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسی کتاب الفرقان نازل فرمائی جس نے کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہنے دی۔ حق اور باطل کو الگ الگ کر دیا۔ ایسی تمیز پیدا کر دی کہ انسان بہانے بناتا رہے' گناہ کے جواز تلاش کرتا رہے لیکن جائز و ناجائز کو وہ خوب جانتا ہے۔ نزول قرآن اور نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے اسے بیان فرمانے کے بعد کیا آپ کو یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ ایک جاہل انپڑھ چرواہا' جنگل میں ساری عمر گزارنے والا بھی جانتا ہے حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ اچھائی کس کو کہتے ہیں؟ برائی کیا ہوتی ہے؟ یہی ابن آدم اسی زمین پر بسا کرتے تھے اور بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک برائیوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ اہل عرب اپنی برائیاں شعروں میں لکھ کر بطور فخر بیت اللہ پہ لٹکا دیا کرتے تھے۔ ڈاکے' چوریاں' زنا کاریاں' بدکاریاں منظوم صورت میں لکھ کر ان پہ فخر کرتے تھے۔ یہ کس کی تعلیمات کا اثر ہے اور کس کے بیان میں اتنی قوت ہے کہ صدیوں کا فاصلہ اس کی طاقت کو کمزور نہ کر سکا؟ پڑھے لکھے نے تو پڑھ لکھ کر' سننے والوں نے تو سن کر جانا لیکن جنہوں نے زندگی بھر کسی سے پڑھا نہیں' سنا نہیں وہ بھی جانتے ہیں حرام کیا ہے؟ حلال کیا ہے؟ جائز کیا ہے؟ ناجائز کیا ہے؟ گناہ کسے کہتے ہیں؟ ثواب کیا ہے؟ یہ اعجاز ہے الفرقان کا۔ اور یہ کمال ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمانے کا۔

نزول قرآن کا مقصد کیا تھا؟ ایسی کتاب جو فرقان تھی

الفرقان جس نے حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے کا حق ادا کر دیا۔ اسے نازل فرمانے کا مقصد کیا تھا؟ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ○ تاکہ میرا حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اس کتاب کے ساتھ کائنات کے لئے عالمین کے لئے غلطیوں اور کوتاہیوں پر مرتب ہونے والے نقصانات کی اطلاع دینے والا بن جائے۔ ہمارے اردو ترجمہ کرنے والے نذیر کا ترجمہ ڈرانا' ڈر سنانے والا یا ڈرانے والا کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں شاید اپنی ساری وسعت کے باوجود اردو کا دامن اتنا وسیع نہیں ہے کہ عربی کے مفاہیم کو سمو سکے۔ عربی میں اس ڈر کو خوف کہتے ہیں جو کسی ہیبت ناک چیز سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ہم سانپ سے ڈر گئے' شیر سے ڈر گئے' کوئی درندہ آ گیا ڈر گئے' چور ڈاکو آ گیا ڈر گئے۔ اس ڈر کے لئے جو جان جانے کا یا نقصان کا ڈر ہو اس کے لئے عربی میں خوف کا لفظ آتا ہے۔ یہ انذار (نذیر کا مصدر) جو ہے یہ اس طرح کا ڈر نہیں ہے۔ یہ ڈر ہے کہ آج ہم ایک کاروبار کر رہے ہیں اس کاروبار کو ہم نہیں سمجھتے' اس کاروبار کا جاننے والا ہمارا کوئی دوست عزیز رشتہ دار ہمیں پاس بٹھا کر بتاتا ہے کہ بھئی یہ جو اینٹوں کا بھٹہ تم نے لگایا اور جس طریقے سے تم اسے چلا رہے ہو اس طرح تمہارا سرمایہ ضائع ہو جائے گا۔ اس کے کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے اس کے کرنے کا فلاں طریقہ ہے۔ اگر نقصان سے بچنا ہے تو اس طرح کرو یہاں برے انجام کا جو اندیشہ ہو گا اسے انذار کہیں گے۔ یعنی جو کچھ آپ کر رہے ہیں اس میں کوئی غلطی ہے' کوئی کوتاہی ہے' اس کے نتیجے میں کوئی خرابی یا نقصان ہونے والا ہے تو اس نقصان کا ڈر انذار کہلائے گا۔ اس کتاب نے' اس کتاب کے حامل رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے غلط روش پر زندگی گزارنے والے انسانوں کو اس غلطی کے نتیجے میں ہونے والے اس نقصان سے آگاہ کیا جو میدان حشر میں واضح ہو گا۔ نزول قرآن کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کا حبیب صلی اللہ علیہ وعلی الہ وسلم کائنات کو اس نقصان کی بروقت اطلاع فرما دیں جو انہیں قیامت کے دن نظر آئے گا۔ اور اللہ ایسا عظیم ہے اسے بندوں کی ضرورت اور احتیاج نہیں ہے۔ اس نے یہ احسان بندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے فرمایا ہے۔ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت' نزول' قرآن' ہدایت کے سامان' بندوں کی بہتری کے لئے نازل فرمائے ورنہ وہ تو ایسی عظیم ذات ہے۔

اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ ساری کائنات پر حقیقی حکومت' اصل حاکمیت اس کی ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی حاکم ہونے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا۔ بلکہ اس دربار میں سب دعوؤں کی قلعی کھل جائے گی جس میں اول و آخر سارے انسان ایک وقت موجود ہوں گے۔ ارشاد ہو گا۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ۔ بات کرو! ملک' حکومت' سلطنت' سلطانی' امارت کس کے لئے ہے؟ اور پھر خود ہی قدرت باری ارشاد فرمائے گی۔

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ حکومت صرف اور صرف اللہ واحد کو سزاوار ہے۔ فرمایا ایسی عظیم ذات ہے

لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی حکمرانی میں کوئی اس کا شریک ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ اور اس کی اپنی ذات کے علاوہ جو کوئی بھی ہے وہ اس کی مخلوق ہے' وہ اس نے خود بنایا ہے اور بنانے کے بعد اس کا میدان عمل مقرر کر دیا۔ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا اس کا میدان عمل مقرر کر دیا ہے۔ ان مقررہ حدود سے وہ متجاوز نہیں ہو سکتا۔ یعنی مخلوق میں یہ جرات نہیں ہے کہ کبھی خالق سے بغاوت کر دے۔ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ جو اندازے اس نے ان کے لئے معین کر دیئے ہیں وہ اس سے باہر نہیں جا سکتے لیکن لوگوں کا حال کیا ہے؟ جن کی طرف قرآن نازل ہوا جن کی طرف نبی علیہ والصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوا ان لوگوں کا حال کیا ہے؟

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اللہ کو بھول جاتے ہیں اور پتہ نہیں کن کن بتوں کو پوجتے ہیں۔ بت پتھر ہی

کے نہیں ہوتے۔ سب سے خطرناک بت جو ہوتا ہے وہ اپنی انا کا' اپنی خواہشات اور اپنے نفس کا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰىہُ آپ نے ان لوگوں کو دیکھا جنہوں نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ (خواہش نفس سب سے بڑا بت ہوتی ہے) اب اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لئے جو باطل ذرائع' موہوم امیدیں اور جاہلانہ نظریات اختیار کرتے ہیں وہ یہی بت کرواتا ہے اور اس نے ان میں عظمت الٰہی کے لئے اب کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہمیں یہ بھول ہی جاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق بھی ہے۔ وہ سب سے طاقت ور اور غالب بھی ہے۔ ہر چیز میں خصوصیات اس نے پیدا کی ہیں۔ اس کے حکم' اس کی لکھی تقدیر سے آگے کوئی بڑھ نہیں سکتا۔ میں اس کا بندہ ہوں' میرا اس کے ساتھ تعلق ہے' میں امتی ہوں اس کے اس حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا جسے وہ اپنا بندہ کہتا ہے' میرا بھی اس سے رشتہ ہے۔ گنہگار سہی خطا کار سہی لیکن اگر صرف نیک اس کے بندے ہیں تو گنہگار کس کے ہیں؟ اگر وہ صرف پارساؤں کا رب ہے تو بدکار کہاں جائیں؟ وہ تو کہہ رہا ہے میں نے اپنے نبی علیہ السلام کو بدکاروں اور مشرکین کے لئے مبعوث کیا کہ میری مخلوق شرک میں گر کر تباہ نہ ہوتی رہے۔ وہ تو اتنا کریم ہے کہ شرک کے لئے بھی اپنا دامان رحمت وا کئے ہوئے ہے۔ کوئی آئے سہی۔ اس شرک سے گلو خلاص کرائے' اس کفر کو چھوڑے سہی۔ ہم لوگ اتنے سادہ اتنے بے وقوف ہیں (یعنی اگر شریفانہ لفظ استعمال کیا جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ لوگ بڑے سادہ ہیں لیکن سیدھی بات کی جائے تو اتنے بے وقوف ہیں) ان لوگوں پہ' ان باتوں پہ' ان ذاتوں پہ امید رکھتے ہیں۔

لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ ھُمْ یُخْلَقُوْنَ جو خود مخلوق ہیں اور کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے۔ یعنی جو خود مخلوق ہے وہ دوسری مخلوق کے لئے خالق کی سیٹ پہ کیسے بیٹھ سکتا ہے؟ وہ خود محتاج ہے دوسرے کی احتیاج کیسے پوری کرے۔

ایک عجیب بات آپ کے مشاہدے میں آئی ہو یا نہ آئی ہو لیکن میں نے محسوس کی ہے میری عادت ہے میں ہر طرح کے لوگوں سے ملتا ہوں۔ یہاں کچھ خانہ بدوش آ جاتے ہیں ان میں بعض اوقات کچھ مسلمان ہوتے ہیں' کچھ غیر مسلم اور کچھ بالکل وحشی۔ پرانے زمانے کی طرز پر زندگی گزارنے والے۔ جنگلی درندے مار کر کھانا اور حرام کھانا ان کا بڑا پسندیدہ شغل ہوتا ہے۔ غرض ان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان خانہ بدوشوں کا سب سے بڑا پیشہ بظاہر گداگری ہوتا ہے۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنی جھگیاں سی لگائیں۔ عورتیں' بچے' مرد سب گدا کے لئے نکل گئے اور گاؤں سے آٹا دانہ مانگ کر لے آئے بظاہر ان کا سب سے بڑا پیشہ گداگری ہوتا ہے جب کہ اندر وہ جوا بھی کھیلتے ہیں' چوریاں بھی کر لیتے ہیں' ڈاکے بھی ڈال لیتے ہیں۔ سارے نہیں لیکن کچھ ایسے ہوتے ہیں۔ کچھ بڑے ڈاکو قسم کے ہوتے ہیں' کچھ چوریاں کرتے ہیں' کچھ ایسے ہوتے ہیں جو گدا کر کے لاتے ہیں اور جوئے میں ایک دوسرے سے ہار جیت کر پھر گدا پہ نکل جاتے ہیں۔ ان ساری خرابیوں کے ساتھ ان میں ایک عجیب بات ہے ایک گداگر کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو وہ گاؤں کے غریب سے غریب آدمی کے دروازے پہ صدا دے گا لیکن دوسرے گداگر کے پاس اگر بوری آٹے کی پڑی ہو تو بھی اس کے پاس مانگنے نہیں جائے گا۔ کوئی بھی گداگر کسی اپنے گداگر رشتہ دار' دوست' بھائی یا پڑوسی سے کبھی نہیں مانگے گا۔ میں نے پوچھا کہ عجیب بات ہے کہتے ہو بچے بھوکے سو گئے اس پاس والے نے روٹیاں دھوپ میں سکھانے کے لئے رکھی ہیں! اس سے کیوں نہیں لیتے؟ وہ کہتے ہیں "گداگر سے ہم گدا نہیں کرتے مانگنے والوں سے ہم مانگا نہیں کرتے" یہ ان کا طے شدہ اصول ہے کہ غریب سے غریب آدمی سے مانگ لیں گے لیکن گداگر کے سامنے دوسرا گداگر ہاتھ نہیں پھیلائے گا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں۔

کہ انہوں نے تو الہ (معبود) بنا لیا ان کو لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّ ھُمْ یُخْلَقُوْنَ۔ جو ان ہی کی طرح خود مخلوق ہیں اور کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ انسان سارے تو خود محتاج ہیں۔ اب اس کو اس طرح گڈ مڈ نہ کیجئے گا کہ کوئی کسی کے پاس ملازمت کرتا ہے' کوئی کسی کے پاس مزدوری کرتا ہے تو جائز نہ ہو گا جو کام شرعاً" کرنا جائز ہے ان کا کرنا بقدر صحت آدمی پر فرض ہے۔ صرف نماز ہی فرض نہیں ہے رزق حلال کے لئے مشقت کرنا بھی فرض عین ہے۔ اس میں امید یہ ہوتی ہے کہ میں اپنا فریضہ ادا کر رہا ہوں اس پہ رزق عطا کرنا اللہ کا کام ہے' رب پھر بھی وہی ہے۔ لیکن اللہ کی عظمت کو بھول کر دوسروں سے امیدیں وابستہ کر لینا اور پھر ان کے کہنے پر مخلوق کو راضی کرنے کے لئے اللہ کی نافرمانی کرنا بدترین شرک ہے خواہ آدمی کلمہ پڑھتا رہے' سجدے کرتا رہے' نمازیں پڑھتا رہے۔ فرمایا انہیں یہ بھی سمجھ نہیں آتی کہ یہ مخلوق ہے وَ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا۔ یہ اپنے نفع نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ یعنی یہ اپنی ذات کو نفع یا نقصان پہنچانے پہ قادر نہیں ہیں۔

لَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا۔ انہیں کسی کی موت پر قدر حاصل نہیں ہے۔ وَ لَا حَیٰوۃً اور کسی کی زندگی پر انہیں اختیار نہیں ہے۔ وَ لَا نُشُوْرًا نہ ان کے سامنے میدان حشر میں کھڑا ہو کر کوئی جواب دے گا۔ کیا حیثیت ہے ان کی؟

میرے بھائی! عجیب بات ہے کہ میں نے ان لوگوں کے سامنے یہ ذکر چھیڑا جو ذاکرین ہیں' رات دن اللہ اللہ کرتے ہیں' اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور میں بدترین شرک اور بدترین مشرکین کے تذکرے کو لے بیٹھا۔ یہ اس وقت کی ضرورت ہے۔ آپ اگر تاریخ انسانی پہ نگاہ ڈالیں اور پھر اس میں امت محمدیہ علی صاحب الصلوۃ والسلام کو دیکھیں تو آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تکمیل انسانیت نظر آئے گی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تب سے آج تک انسان اللہ کے قرب کی جن عظمتوں کو پانے کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے' جس مقصد کے لئے تخلیق کیا گیا تھا اس کو پانے کا راستہ اسے صرف اور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے نصیب ہوا۔ اور سب سے بڑا نقصان اسے اس وقت ہوا جب اس کی امیدیں عظمت باری سے ہٹ کر کسی اور چیز سے وابستہ ہو گئیں۔ یاد رہے کہ یہ صرف بتوں کے سلسلے ہی میں نہیں ہے اگر اللہ کے مقابلے میں ہم فرشتوں کو لے آئیں' فرشتوں کی پوجا کرنے لگیں' فرشتوں سے وہ امیدیں وابستہ کر لیں تو شرک ویسا ہی ہو گا بلکہ بدترین شرک ہو گا۔ اگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام سے وہ امیدیں وابستہ کر لیں جو اللہ سے ہونی چاہیں تو یہ اس سے بھی بڑا ظلم ہو گا اور یہ نہ صرف شرک ہو گا بلکہ انبیاء علیہم السلام کی نافرمانی بھی ہو گی۔ اگر اہل اللہ سے' ولی اللہ سے اور نیک لوگوں سے وہی امیدیں وابستہ کر لیں تو یہ بدترین شرک ہو گا۔

میرے بھائی! میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ صوفی کو توحید کا وہ درجہ پانا چاہئے جو سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمت اللہ تعالیٰ علیہ کو حاصل ہوا۔ روایت میں لکھتے ہیں۔

کہ تجھے اگر بیماری ہو گئی' بخار ہو گیا اور تو نے طبیب سے بات کی' ڈاکٹر سے بات کی تو درست۔ علاج کے لئے یہ ضروری ہے لیکن ہر آنے جانے والے سے تو کہے کہ میں مر گیا' مجھے بخار ہو گیا تو اس کا مطلب ہے کہ تو خالق کی شکایت مخلوق کے سامنے کر رہا ہے۔ تیری عمر اگر پچاس ساٹھ برس ہے اور تو نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میری صحت ٹھیک ہے ساٹھ برس صحت سے انجائے (Enjoy) (لطف اٹھانا) کرتا رہا' کسی کو نہیں بتایا۔ بخار ہو گیا تو ہر بندے کو بتا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے تو خالق کی شکایت مخلوق سے کر رہا ہے۔ اور کیا ایسا ہوتا نہیں کتنی نعمتیں ہوتی ہیں جن کا ہم شکر ادا نہیں کرتے لیکن ذرا سی تکلیف آتی ہے تو اللہ سے شکایت ہی نہیں غیر اللہ سے امیدیں بھی وابستہ ہو جاتی ہیں کہ فلاں کے پاؤں چوم لو یہ ہو جائے گا۔ خدا کا خوف کھاؤ! کچھ نہیں ہو گا۔ سب مخلوق ہے۔ مخلوق' مخلوق کو کیا دے

گی؟ گداگر، گداگر کو کیا دے گا؟ مالک سے مانگو۔ جو مانگنا ہے مانگو لیکن مالک سے مانگو۔ جو مانگنے نہیں جاتا اس سے مانگو۔ جو خود مانگ کے کھاتا ہے وہ کسی کو کیا دے گا بھائی؟ اللہ اللہ کا مقصد ہی توحید بازی کو جاننا ہے، اپنے خالق کو پہچاننا ہے۔

تصوف دراصل ترجمہ ہے تزکئے کا۔ اگرچہ علمائے حق نے اس کے مختلف معانی لکھے ہیں اور مختلف تعبیریں کی ہیں لیکن وہ محض تعبیریں ہیں۔ جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کے پہلے پہلے ترجمے جو غیر ملکی زبانوں میں ہوئے ان میں سرفہرست ہے اور فارسی والوں نے تزکئے کا ترجمہ تصوف سے کر دیا۔ عربی میں تذکیہ، چونکہ صفائے باطن سے متعلق تھا تو انہوں نے پاکیزگی کو صفا کے معنوں میں لے کر تصوف اسی وزن پہ بنا دیا۔ صفائے باطن، صفائے قلب۔ اب تزکیہ تعلیم کتاب و حکمت پر مقدم ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ تزکئے کی اساس یہ ہے کہ قلب کو اللہ پر اعتماد ہو جائے۔ اگر اعتماد علی اللہ نصیب نہیں ہے تو کوئی تزکیہ نصیب نہیں ہوا۔ تزکیہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ قلب کو اعتماد علی اللہ نصیب ہو۔ موت بھی سامنے آئے تو اسے یقین ہو کہ اگر میرا وقت اللہ کی طرف متعین ہے تو مجھے مرنا ہے ڈرنے کی کیا بات ہے؟ اور اگر مالک کی طرف سے میرا وقت نہیں آیا تو یہ جو موت بن کر سامنے کھڑا ہے یہ مجھے موت نہیں دے سکتا۔ چند لقموں، معمولی تکالیف یا کسی عہدے کے لالچ کے لئے اللہ کی نافرمانی اور مخلوق کی خوشامد کرنے والا کب مسلمان ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے! اور پھر اگر یہ بات اور یہ اوہام ان لوگوں میں آجائیں جو ذکر بھی کرتے ہیں تو کتنی عجیب بات ہے۔

میں تاریخ تصوف کی بات کر رہا تھا۔ آپ تاریخ تصوف میں دیکھیں گے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں جو آیا صحابیت سے سرفراز ہوا۔ مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، امیر، غریب۔ آگے ان کے مراتب اپنے اپنے ہیں لیکن بنیادی طور پر سب صحابی بنے۔ صحابہ کی خدمت میں جو پہنچے سب تابعی قرار پائے۔ تابعین کی خدمت یا صحبت جنہیں نصیب ہوئی سب تبع تابعین قرار پائے۔ لیکن اس کے بعد ہر آنے والے کو اللہ اللہ کسی نے نہیں سکھائی۔ اہل اللہ کے بڑے بڑے عظیم نام جن کی ہم جوتیوں کی خاک برابر بھی نہیں ہیں ان ناموں کو دیکھیں تو ان کے ساتھ ہمیں دو چار، پانچ دس آدمی ملتے ہیں جنہیں انہوں نے اللہ اللہ سکھائی۔ باقی لوگوں کو انہوں نے ظاہراً" وعظ نصیحت پر رکھا لیکن قلبی کیفیات نہیں بتائیں۔ اس لئے کہ لوگوں میں اہلیت ہی نہیں ہوتی کہ انہیں اتنی عظیم دولت دی جائے۔ لوگ اس نعمت کو لے کر پھر عقائد کی کمزوریوں میں مبتلا ہوئے اور یہ ان کے حق میں زیادہ خطرناک تھا۔ ہم پوری بارہ تیرہ سو سالہ تاریخ دیکھیں تو خیرالقرون کے بعد ہمیں نظر نہیں آتا کہ کسی ولی اللہ نے ہر آنے والے کو تصوف سکھایا ہو۔ یہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد، چودھویں صدی کے آخر میں اللہ نے یہ نعمت کسی کو عام کرنے کا حکم دیا تو شاید اس لئے کہ اب اس کے بغیر لوگوں کا بچنا محال ہو چکا ہے۔ اگر رات دن اللہ اللہ کرنے والے بھی اس دلدل میں گھٹنے گھٹنے ڈوبے ہوئے ہیں یا کمر کمر تک ڈوبے ہوئے ہیں تو جو بالکل نہیں کریں گے وہ کیا کریں گے؟ اور یہ اس دور کی ضرورت تھی کہ اللہ نے اسے عام کر دیا۔ لیکن یاد رکھو! اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ پر اعتماد پختہ ہوتا چلا جائے اور غیر اللہ کو آدمی پاؤں کی ٹھوکروں سے اڑاتا ہوا چلا جائے۔

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس دوستوں کی بے شمار شکایات آتی ہیں جن میں ایک سب سے بڑی شکایت تو یہ ہوتی ہے کہ "جی میرے بچوں کی شادی کسی نے بند کر دی، میری اولاد ہونا کسی نے بند کر دیا" اگر اولاد ہونا بھی کوئی بندہ روک سکتا ہے، شادی ہونے کے وقت کو کوئی بندہ روک سکتا ہے تو اس کا مطلب ہے اللہ کریم چھٹی چلے گئے۔ وہ جو کہتا ہے۔

فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ ہر مخلوق کے لئے میں نے ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔ شاید اس کے اپنے اندازے میں تیرہ،

شادی لیٹ (تاخیر) لکھی ہو' شاید اسے ہی منظور نہ ہو کہ وہ تجھے اولاد دے۔ اولاد پیدا کرنا فرض عین نہیں ہے۔ بندہ اولاد پیدا کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ اللہ کا بندہ بننا زندگی کا مقصد ہے۔ اولاد تو کافر کی بھی ہوتی ہے' بدکار کی بھی ہوتی ہے' بے دین کی بھی ہوتی ہے۔ تو کیا اولاد پیدا کرنا ہی مقصد حیات تھا؟ اللہ کی مخلوق ہے وہ جتنے بندے جب چاہتا ہے پیدا کرتا ہے' جتنے بندے جب چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے۔ وہ ایسا قادر ہے کہ شہنشاہ ایران نے ساری زندگی کوشش کی لیکن شہنشاہ کو اس نے اولاد نہ دی اور جب شہنشاہ کو اولاد دی تو اس سے شہنشاہیت چھین لی' قبر کے لئے جگہ نہیں مل رہی تھی۔ وہ ایسا قادر ہے' ایسا بے نیاز ہے کہ جو حکومت کا وارث چاہتا تھا اسے نہیں دیا۔ بے شمار شادیاں کیں' عورتیں بدلیں' علاج کرائے اس نے نہیں دیا اور پھر قدرت نے دوسرا کرشمہ دکھایا تو اسے اولاد دے کر اس سے سب کچھ چھین لیا۔ حتیٰ کہ وہ مر گیا تو کوئی ملک اس کو قبر کی جگہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ ایسا قادر ہے اس کے قانون میں کوئی جادوگر جادو سے کچھ نہیں باندھ سکتا۔ روزگار کرنے کا ہمیں سلیقہ نہیں آتا۔ اس نے کائنات میں اسباب بنائے۔ اب اگر کوئی زہر کھائے گا تو اسے شفا نہیں ہو گی۔ جب آپ کو کاروبار کرنا نہیں آئے گا' جس کام کو آپ نہیں سمجھتے اس میں ہاتھ ڈالیں گے تو نقصان تو ہو گا پھر کہیں گے "جی کسی نے جادو کر دیا۔" یار خدا کا خوف کرو! اگر اللہ اللہ کرنے کے بعد بھی تمہارے اوہام وہی ہیں تو کیا فائدہ؟ اس محنت و مجاہدے سے آپ کو کیا حاصل ہو گا؟ اگر ہم اللہ ہی کو نہ پہچان سکے' جس کا نام لیتے ہیں اگر اس پر یہ اعتماد ہی نہیں ہے کہ جس نے مجھے ایمان بخشا ہے' جس نے مجھے اپنے ساتھ راتوں کو اٹھ کر باتیں کرنے کی توفیق دی ہے' جس نے مجھے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی ذات کو یاد کرنے کی توفیق ارزاں کی ہے وہ میری دیکھ بھال بھی کرتا ہو گا۔ اگر ہم اتنا بھی نہ جان سکے تو ہم نے تصوف سے کیا حاصل کیا؟ اور کونسا تزکیہ ہوا؟ یہ سب شیطانی وساوس ہیں۔ دینوی امور میں جو خرابیاں آتی ہیں ان کے دینوی اسباب تلاش کرو۔ کہیں کوئی کمزوری ہو گی جس کے نتیجے میں نقصان ہوا۔ کوئی کوتاہی کوئی قصور ہو گا..... تلاش کرو کہ قصور کہاں ہے جو دوسروں کا کام چل رہا ہے اور آپ کا نہیں چلتا۔ اس کا سبب تلاش کرو۔ اللہ سے دعا ضرور مانگو لیکن خدا کے لئے یہ مت سوچو کہ کسی نے روک دیا ہے۔ کوئی نہیں روک سکتا' کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا' کوئی کچھ نہیں سنوار سکتا۔ اہل اللہ کو خدا غریق رحمت کرے یہ عجیب لوگ ہیں۔ یہ ایسے عجیب لوگ ہیں کہ یہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے الگ ہوتے ہیں۔ یہ جب دنیا میں موجود ہوتے ہیں تو سوائے فرائض اور ذمہ داریوں کے کسی میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ جب یہ دنیا سے گزر جاتے ہیں تو بقول علمائے حق کے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد حق کے مطابق۔

اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النِّيْرَانِ۔ کہ قبر تو بجائے خود جنت کے باغوں میں سے باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے گڑھا اور اگر قبر میں کسی کی اتنی پذیرائی ہو کہ اسے جنت کی نعمتیں حاصل ہوں تو جو دنیا میں بیٹھا ہوا دنیا کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتا وہ وہاں سے اٹھ کر مداخلت کرنے آئے گا؟ اور اگر خدانخواستہ قبر میں دفن ہونے والا نجات نہیں پاسکا اور دوزخ کی مصیبتوں میں گرفتار ہے تو وہ اسے چھٹی دیں گے کہ جا کر دنیا والے کا کام کر کے آ جا۔ تو پھر جو دنیا سے گزر چکے ہیں ان کے لئے صرف دعا کیا کرو۔ انہیں گھسیٹ کر اپنے کاموں میں مت لاؤ۔ یہ عقائد اختیار نہ کرو کہ فلاں صاحب قبر تجارت میں مدد دے گا' فلاں صاحب قبر ملازمت دلا دے گا اور فلاں صاحب قبر میرے مرض کا علاج کر دے گا یار! خدا کا خوف کرو۔ کچھ اللہ کے پاس بھی باقی رہنے دو کہ وہ کیا کرتا ہے؟ اگر یہ سارے کام مخلوق نے ہی بانٹ لئے تو اللہ کیا کرتا ہے؟ اس کی عظمت کس کام آئے گی؟ ہاں اہل اللہ وہ کچھ کر گزرتے ہیں جو صرف وہی کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی کو واصل باللہ کر دیتے ہیں۔ ایک

بے دین کو دین دار بنا دیتے ہیں' ایک بدکار ان کی صحبت میں نیک ہو سکتا ہے' ایک کافر ان کے ساتھ ملنے سے مومن ہو سکتا ہے' ایک اللہ کی عظمت سے ناآشنا اللہ کی عظمت سے آشنا ہو سکتا ہے اور یہ اتنا بڑا کام ہے کہ ساری دنیا کی نعمتیں چھن جائیں اور یہ نعمت نصیب ہو جائے تو یہ دو عالم کی سر بلندی و سرفرازی ہے۔ دنیا کی نعمتوں میں رکھا کیا ہے؟ دنیا میں نعمت نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ سوائے قرب الٰہی کے باقی سب مصیبتیں ہیں۔

اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ یہ مال دولت' یہ بیٹے بھتیجے' جن بازوؤں پہ تم فخر کرتے ہو یہی تو آزمائش ہے' یہی تو مصیبت ہے۔ یہ مال نہ ہوتا یہ جنجال نہ ہوتے' یہ رشتے ناطے نہ ہوتے تو بندہ بے فکر اللہ ہی اللہ کرتا۔ یہی تو زنجیریں ہیں جو اسے دوسری طرف کھینچ کے لے جاتی ہیں۔ جنہیں ہم انعام سمجھ رہے ہیں انہیں اللہ مصیبت قرار دے رہا ہے۔ ان کی طلب و آرزو میں اللہ کی عظمت کو مت بھولو۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جب ہم تاریخ انسانی پڑھتے ہیں تو افریقہ کے جنگلی اور وحشی قبائل جس طرح روحوں کی پرستش کرتے تھے اور سپیرٹ کے وہ چراغ جلاتے تھے' دھمال ڈالتے تھے اور ان سے امیدیں رکھتے تھے مسلمانوں نے اس طرح کے عقائد اختیار کرنے شروع کر دئے ہیں ۔ وحشی قبائل کے نظریات اب قدرے بہتر ہوتے جا رہے ہیں وہ ان چیزوں کو چھوڑتے جا رہے ہیں اور ہمارے ہاں اب اس طرح کے عقائد و نظریات آ رہے ہیں۔ خدا کے لئے دنیا میں جتنی مصیبتیں آتی ہیں۔

وَ مَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ وہ ہماری اپنی کوتاہیوں' لغزشوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہوتا ہے ہر مصیبت کے پیچھے ہمارا قصور ہوتا ہے۔ اس قصور کو تلاش کرو اور جتنی نعمتیں ملتی ہیں' جتنی راحتیں نصیب ہوتی ہیں۔ **فبنعمتہ من اللہ** وہ اس کا احسان ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اگر کسی کو آسائش نصیب ہوتی ہے تو اس کا احسان ہوتا ہے۔ مصیبت آتی ہے تو اس میں ہمارا اپنا قصور ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! مراقبات و منازل' مشاہدات و مکاشفات ان سب کا انحصار ایک بات پر ہے کہ یہ ہمیں کس حد تک اللہ کا اعتماد اور اللہ پر یقین دیتے ہیں؟ اور ہمیں اللہ کریم کے کتنا قریب لے گئے؟ ساری زندگی' ساری محنت' ساری کاوش کا حاصل صرف یہی ہے۔ اگر خدانخواستہ اس نعمت اور مشاہدے ہونے کے یا یہ دلائل سننے کے بعد بھی ہم غلط سمت گئے تو جواب وہی بڑی سخت ہو گی۔ اس بارگاہ میں جاہل کی سزا کم ہو گی جب کہ عالم کی سزا کئی گنا زیادہ ہوگی' جاننے والے کی سزا زیادہ ہو گی۔ اب ایک شخص کو دنیا میں بھی سمجھ نہیں آتی اور دوسرے کو وہ برزخ کے مشاہدات کرا دیتا ہے تو دونوں بیشک ایک سا گناہ کر لیں سزا دونوں کی الگ الگ ہو گی' جواب داری الگ الگ ہو گی۔ تو میرے بھائی! یہ مراقبات و منازل بڑی عظیم نعمت تو ہیں لیکن اس کے ساتھ عظیم ذمہ داریاں بھی ہیں اور سب سے کامیاب ترین بندہ وہ ہے جو عظمت الٰہی کو پا لے' اپنی کمزوری کو جان لے' اپنی احتیاج کو سمجھ لے۔

یاد رکھو! ہر نعمت وہی دیتا ہے۔ اسباب و ذرائع اختیار کرنا سنت الٰہی ہے۔ جو ذرائع اس نے بنائے ہیں اور جو جائز وسائل ہیں' انہیں اختیار کرنا ہی توکل ہے۔ اسباب چھوڑنا توکل نہیں ہے۔ اسباب اختیار کرنا اور بھروسہ رب پر کرنا (اسباب پر بھروسہ نہ کرنا) یہ توکلہ ہے۔ اور یہ مشکل کام ہے۔ اسباب چھوڑ کر بیٹھ رہنا توکل نہیں ہے اسباب اختیار کر کے بھروسہ رب پہ کرنا اور (اسباب پر نہ کرنا) اصل توکل ہے اور کسی ایسی بات کی طرف قدم مت بڑھاؤ جو غیرت الٰہی کو جوش دینے کا سبب بن جائے۔

بخاری شریف میں ایک بڑا لمبا واقعہ ہے میں آپ کو مختصر سا سناتا ہوں۔ بنی اسرائیل کا ایک نیک آدمی چار سو برس زندہ رہا (اس زمانے میں عمریں طویل ہوتی تھیں۔ بالغ ہونے کے بعد اس نے آبادی کو چھوڑ دیا۔ عبادات اختیار کیں' سمندر کے ایک ٹاپو پہ چلا گیا۔ رات دن اللہ اللہ کرتا تھا۔ اللہ کریم نے اس کے لئے وہاں ایک ایسا انگور جیسا کوئی

پھل اگا دیا جس کی بیل سارا سال پھل دیتی تھی۔ چشمہ پیدا کر دیا۔ چشمے سے پانی پیتا' وہی پھل کھاتا' رات دن عبادت کرتا اور یوں عبادت کرنے میں چار سو سال بسر کر دیئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ ملک الموت انبیاء علیہم السلام کے پاس آنے پہ پہلے ان سے اجازت لیتا ہے۔ اس غیر نبی سے بھی ملک الموت نے پوچھا تھا کہ تم کس طرح کی موت پسند کرتے ہو؟ اللہ نے اسے حکم دیا تھا کہ اس سے پوچھ لو۔ اس نے کہا کہ مجھے دو رکعت نماز کی نیت کرنے دو۔ دوسری رکعت کے دوسرے سجدے میں ہوں تو میرا روح قبض کر لینا۔ آپؐ فرماتے ہیں جبرائیل امین نے مجھے بتایا کہ اس کا وجود خراب نہیں ہوا اور میں اب بھی جب آسمان پر جاتا ہوں یا نیچے اترتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ سجدے میں پڑا ہے۔ قیامت کو اس طرح سجدے سے اٹھایا جائے گا ارشاد ہو گا۔

اِذْهَبُوْا بِعَبْدِیْ اِلٰی جَنَّتِیْ بِرَحْمَتِیْ۔ میرے بندے کو میری رحمت اور بخشش کے طفیل جنت میں داخل کر دو۔ تو وہ چھوٹی سی بات عرض کرے گا کہ اے خدایا تیری رحمت کا تو اندازہ نہیں ہے لیکن میری محنت بھی تو ہے۔ میں نے بھی چار سو سال سوائے تیرے کسی سے بات نہیں کی' کسی کو دیکھا نہیں۔ صرف اور صرف تیری عبادت کرتا رہا۔ تو میری چار سو سالہ عبادت بھی تو میری بخشش کا سبب ہو گی یا نری عطا ہی اس کا سبب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ارشاد ہو گا حساب کر لو' میری نعمتوں کا اندازہ کر لو اپنے سجدوں کا حساب کر لو۔ ارشاد ہو گا کہ چار سو برس جو آنکھ کی بینائی اس نے استعمال کی اس کی قیمت اس کے سجدے پوری نہیں کر سکیں گے۔ باقی نعمتوں کو رہنے دو پہلے ہی حساب میں صرف اس نعمت (جس سے جو چار سو سال دیکھتا رہا) کے بدلے میں اس نے جو عبادت کی وہ کم پڑ جائے گی۔ فرشتوں کا فیصلہ ہو گا کہ باقی جتنی نعمتیں چار سو برس استعمال کیں ان کی قیمت کا جو اندازہ ہے اتنا عرصہ تمہیں جہنم میں رہنا ہو گا۔ پھر دیکھی جائے گی۔ تب پکارے گا کہ بار الہا تیری رحمت کے بغیر سہارا نہیں ہے۔ تو ارشاد ہو گا۔ اگر رحمت کا طالب ہے تو پھر اس پر رحم کرو' جانے دو جنت میں۔ لیکن حساب چاہتا ہے تو اسے لے جاؤ اپنا حساب پورا کر لے۔ میرے بھائی! ہمارے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ عظمت الٰہی بھول جاتی ہے۔ جادو ٹونے کی باتوں پہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اللہ اللہ کرنے والا بندہ بھی جادو ٹونے کا اسیر ہو جائے! سمجھ نہیں آتی۔ کیا بتایا جائے؟ کس کو بتایا جائے؟

خدا کے لئے اللہ سے بات کرنا سیکھو۔ بڑی سنتا ہے' اسے بڑا پسند آتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ پسند ہے اللہ کو کہ اس کا بندہ اپنی بات خود اس سے کرے۔ اسی لئے اس نے نبی علیہم السلام بھیجے کہ میرے بندوں کو میرے دروازے پہ لے آؤ۔ میرے ساتھ بات کریں۔ مولانا رومی نے وہ منظوم کر دیا ہے۔

دید موسیٰ یک شباتی را براہ
کو ہمیں گفتہ خدا و الہا

موسیٰ علیہ السلام نے ایک گڈریئے کو دیکھا اللہ سے باتیں کر رہا تھا

تو کجاریں تا شوم من چاکرد

"خدایا تو ملتا نہیں ہے۔ مل جاتا میں تیرے کپڑے دھوتا' تیرے بالوں میں کنگھی کرتا میں تیری خدمت کرتا۔"

گر ترا بیماری ایدو پیش
من ترا غمخوار باشم ہم چوں خویش

"کبھی تو بیمار بھی پڑتا ہو گا تو میں بیٹوں کی طرح تیرے پاؤں دباتا' تیری دوائی لے آتا' تجھے پانی پلاتا' خدمت کرتا۔" انہوں نے حکایت لکھی ہے۔

بیہودہ مے شباں گفت موسیٰ

وہ اس طرح کی بے ہودہ باتیں کر رہا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تو کس سے بات کر رہا ہے؟ کوئی سامنے تو ہے نہیں۔

گفت باں کش کہ مارا آفریں
این زمین و چرخ آمد پدیر

اس نے کہا میں تو اس سے بات کر رہا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا' یہ زمین و آسمان بنائے۔

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سرشدی
خود مسلمان نہ شدہ کافر

انہوں نے فرمایا تو تو کافر ہو گیا تو کفر بک رہا ہے تو تو اللہ کے غضب کو دعوت دے رہا ہے اور اگر اسی طرح بکواس کرتا رہا تو اس کا غضب کائنات کو تباہ کر دے گا۔

جامہ ہابدرید آہ کرد تخت سر بیابان رفت

اس نے کپڑے پھاڑ دئے' مویشی اور اپنا باڑھ چھوڑ دیا گھر بار چھوڑ کر جنگل کو بھاگ گیا اور اس ڈر سے چلاتا جا رہا تھا کہ میں نے اپنی جہالت سے اپنے رب کو ناراض کر دیا۔ میں تو راضی کرنے کے بہانے کر رہا تھا اور یہ بندہ کہتا ہے کہ تو نے اسے ناراض کر دیا۔ تو فرماتے ہیں۔

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا
بندہ مارا زما کر دی جدا

فوراً" وحی آئی کہ موسیٰ پکڑ اسے۔ میرا بندہ تو نے مجھ سے ناراض کر دیا۔ وہ تو میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

تو برائے وصل کردن آمدی

تجھے میں نے بھیجا تھا کہ جو مجھ سے دور ہیں انہیں میرے پاس لے آ' وہ مخاطب تو مجھ سے تھا تو اسے بات کرنے کا سلیقہ سکھاتا تو نے اسے ڈرا کر بھگا ہی دیا۔ اسے پکڑ کے لے آ۔

تو برائے وصل کر دند آمدی

تیرا کام جو مجھ سے باتیں کر رہے ہیں ان کو بھگانا نہیں ہے' جو مجھ سے بچھڑ چکے ہیں انہیں واپس لانا ہے۔

تو وہ تو اتنا کریم ہے کہ اپنے بندوں کا انتظار کرتا ہے کبھی اس لہجے بات کر کے تو دیکھو۔ اللہ کریم یہ شعور عطا کر دے کہ ہم اپنے رب کو اپنے پاس پائیں۔ (۹۵-۷-۷)

اسلام کے خلاف جنگ

اسلام سے کون ڈرتا ہے؟ مسلمان سیاستدان' مسلمان وزرائے اعظم' مسلمان وزراء' مسلمان گورنر' مسلمان صدر اور بادشاہ سب ہی اسلام سے خوف زدہ ہیں۔ اسلام سے ڈرتے ہیں۔ اور اسلام کو اپنے ملک سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اسلام کے خلاف جنگ مسلمان حکمران ہی کر رہے ہیں۔ اسلام کے خلاف جو اصل جنگ ہو رہی ہے وہ امریکہ برطانیہ یا اسرائیل نہیں بلکہ مسلمان سیاستدان کر رہا ہے۔ مسلمان حکمران کر رہا ہے مسلمان حکومتیں کر رہی ہیں کہ کہیں اسلام ہمارے ملک میں نہ آجائے کہ ان کو شہنشاہت سے' فرعونیت سے' اتر کر ایک عام انسان جیسی حیثیت نہ دے دی جائے۔

محبت کے تقاضے

مولانا محمد اکرم اعوان

معاملات محبت میں ہم جتنے اوصاف جتنی حکایات اور جتنے واقعات یا تجربات بیان کرتے ہیں جو حدود متعین کرتے ہیں یہ سب ہماری اپنی سمجھ کے مطابق اور ہماری قائم کردہ ہیں اپنے تخیل اور ذہن کے مطابق ورنہ حق یہ ہے کہ محبت حدود و قیود سے بہت بالا تر ہے اس کے اسباب و ذرائع کی کوئی سمجھ نہیں آئی اور حق یہ ہے کہ

کارہ کہ خبرشد خبرش باز نیابد

حق یہ ہے کہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے کہ عشاق کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ ہم عشق کے مریض ہیں محبت کرنے والوں کو ایک درجے پر آ کر یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ ہم محبت کرتے ہیں اس لئے اس کی کیفیات کو سمجھنا سمجھانا یا بیان کرنا ممکن نہیں اور کیفیات ویسے بھی سمجھنے سمجھانے یا بیان کرنے کی نہیں ہوتیں کیفیات وارد ہوتی ہیں جس پر بیتی ہیں جو ان میں سے گزرتا ہے اسے ہی سمجھ آ سکتی ہیں۔

حضرت رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ فرشتہ کتنا مقدس اور پاک، معصوم مخلوق ہے اللہ کی نوری مخلوق ہے اور ہر معاملے میں تکوینی امور پہ اللہ نے اسقدر دسترس دی ہے لیکن اس کے باوجود اگر اسے یہ کہا جائے کہ گڑ کتنا میٹھا ہوتا ہے تو اس سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، کوئی علاقہ نہیں، نہ اسے بھوک لگتی ہے نہ اس کے لئے میٹھے کڑوے ذائقے کی کوئی بات ہے۔ نہ وہ کھاتا ہے نہ وہ سمجھتا ہے۔ اس کے لئے آپ کو اس سے پوچھنا پڑے گا جس کے پاس قوت ذائقہ بھی ہے۔ اور اسے بھوک بھی لگتی ہو وہ اس کو کھا بھی سکتا ہو شاید وہ بتا سکے۔ وہ جو کسی نے کہا تھا

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازہ طوفان نہیں ہوتا

لیکن ہم نے جو اس کے ساتھ ایک جملے کا اضافہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ اس کا اثر انسان کے اعتقادات ایمانیات، اعمال کردار اور عبادات پر کیا ہوتا ہے۔ یا ہمارے کردار اور ہماری عبادات کا اثر اس جذبہ محبت کو پیدا کرنے میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔ تو اس دوسرے حصے کے متعلق یہ ایک آیت کریم سورۃ العنکبوت میں ہے بیسویں پارے میں نویں آیت ہے۔

ہمارا انسانی کردار جو ہے اس کا ایک عجیب اثر ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے قرآن حکیم میں ارشاد ہے اللہ کا کہ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں سے کہہ دیجئے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ اگر تمہیں اللہ کی محبت کا دعویٰ ہے اگر تم یہ کہتے ہو کہ ہم اپنے مالک سے محبت کرتے ہیں فاتبعونی تو پھر میرے پیچھے پیچھے چلو۔ میری غلامی اختیار کر لو۔ میرا اتباع اختیار کر لو۔ اس سے کیا ہو؟ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ میرے پیچھے چلنے سے اللہ تم سے محبت کرنے

لگے گا۔ تمہارا وعدہ یہ ہے کہ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں لیکن میرا اتباع کرنے سے عقائد اور اعمال میں یہ ہو گا کہ اللہ کریم تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ اور جب اللہ کسی سے محبت کرتے ہیں تو محبت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس شخص کو بھی اللہ کی محبت نصیب ہو جاتی ہے۔ یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ وہ جن بندوں سے محبت کرتا ہے وہ جواب میں اس سے محبت کرتے ہیں اس لئے کہ وہ بندون کے ہر حال سے ہر حسن و قبیح سے ہر آن سے واقف ہے دیکھ رہا ہے۔ تو جب وہ اس سے محبت کرتا ہے اور وہ تب کرتا ہے جو کوئی بندہ اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلام بن جائے۔ خلوص دل سے اپنی پوری کوشش کرے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے میں۔

یاد رکھیں! یہ بڑا نازک سا معاملہ ہے اور اکثر لوگ اسے سمجھتے نہیں ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے جو ارشاد کہلوایا گیا رب جلیل کی طرف سے وہ یہ ہے فاتبعونی میرے پیچھے پیچھے چلو اب کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو آپ سے آگے نکلنے کی جرات کرے اور یہ آگے نکلنا کیا ہو گا۔ مثلاً" عقائد میں ہم کوئی ایسا عقیدہ اختیار کریں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہو تو یہ پیچھے چلنا نہ ہو گا یہ آگے نکلنا ہو گا۔ اسی طرح عمل میں ہم کوئی ایسا عمل اختیار کریں جیسی کہ بے شمار رسومات بن گئی ہیں ہم کوئی ایسی رسم اختیار کر لیں اسے ثواب سمجھ کر عبادت سمجھ کر جس کا ثواب اور عبادت ہونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہ ہو تو یہ پیچھے چلنا نہیں ہو گا یہ آگے نکلنا ہو گا۔ اپنی غلطی سے اپنی نادانی سے بعض اوقات بے شمار لوگ بلکہ بعض اوقات کیا ہمارے اردگرد آپ اپنے ماحول میں دیکھیں تو بے شمار لوگ اس مصیبت میں گرفتار ہیں۔

ایک چھوٹی سی مثال میں نے پچھلے دنوں عرض کی تھی کہ ہمارے بہت سے دوست یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر بڑا چلا چلا کر صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں یہ بہت نیکی ہے آدھی رات کو بے چارے اٹھ کر شروع ہوتے ہیں اور سارا دن ساری رات آذان کے ساتھ لگے رہتے ہیں لیکن وہاں حال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجرہ مبارک کے اندر تشریف رکھتے ہیں ایک صحابی جو صحرائی تھا بدوی تھا مال مویشی چھوڑ کر باہر سے آیا اب اسے واپس جانے کی بھی جلدی تھی زیارت سے مشرف ہونا بھی اس کا مقصد تھا کچھ پوچھنا بھی تھا اسے وہ پوچھنا بھی محض اللہ کے دین کے لئے تھا اجازت کے لئے تھا کوئی دینی بات سمجھنا تھی اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سمجھنا چاہتا تھا اس نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آکر پوچھا پتہ چلا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجرہ مبارک میں ہیں اس غریب نے دروازے پر جا کر نہایت ادب و احترام سے یہ آواز دی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائیے میری گذارش سنئے مجھے جانا بھی ہے اس غریب کی اتنی سی حرکت پر دروازہ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کھڑے ہو کر پورے ادب و احترام اور پوری محبت سے بھلا صحابہ جیسی محبت کوئی کہاں سے لائے گا۔ لا سکتا ہی نہیں کہ اور کسی کی آنکھوں نے اس رخ روشن کو دیکھا ہی نہیں آپ میں اگر سن کر محبت کے مدعی ہو سکتے ہیں تو وہ جو برسوں خلعت عالیہ میں رہے۔

اللہ کریم کو یہ بات پسند نہیں آئی فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۔ کتنے جاہل ہیں یہ لوگ یہ رعایت کی اللہ نے اس کے خلوص اس کے منصب صحابیت' اس کے عشق مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رعایت کرتے ہوئے فرمایا یہ اجڈ ہے گنوار ہے بے وقوف ہے اسے عقل نہیں ہے اسے کیا جرات تھی کہ دروازہ اقدس پہ کھڑے ہو کر آواز دی۔ اسے چاہئے تھا کہ یہ در اقدس پہ بیٹھ رہتا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی پسند سے باہر تشریف لاتے۔

حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس کی طرف متوجہ ہوتے یہاں مفسرین لکھتے

ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی اور کام سے نکلے کسی اور شخص سے بات کرتے ہوئے نکلے کسی اور طرف متوجہ نکلے تو بیٹھنے والے کو شرعاً" پھر بھی اجازت نہیں ہے کہ آواز دے کر ٹوکے۔ درمیان میں اپنی بات کرے حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْہِ سے ظاہر ہے جب تک آپ خود اس کی طرف متوجہ نہ ہوں اسے بات کرنے کے لئے لب نہیں کھولنے چاہئیں۔ اور اگر کوئی یہاں سے لاوڈ سپیکر پر چلا کر پکارے آپ اس کے دوسرے پہلوؤں کو چھوڑیں وہ حاضر ناظر مانتا ہے یا نہیں یہ ماننا جائز ہے یا نہیں آپ اس لمبی بحث کو چھوڑیں صرف یہ چھوٹا سا نقطہ لے لیں کہ کیا اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے چلنا یا آپ کی شان سے آگے بڑھنے کی بات ہے کبھی ہم نے کسی مہمان کو کسی عزیز کو کسی بزرگ کو کسی دوست کو اگر حاضر یا موجود ہو اپنے پاس آپ نے کبھی گھر آنے والوں کو سلام کہنے کے لئے لاوڈ سپیکر استعمال کیا ہے؟ ویسے بھی تو گستاخی ہے ایک دوسرے کو کبھی لاوڈ سپیکر پر سلام دے کر دیکھیں تو وہ ویسے خفا ہو جائے گا کہ یہ مذاق ہے اور اگر حاضر ناظر نہیں سمجھتے جیسا کہ صحیح اسلامی عقیدہ ہے حاضر ناظر ہونا محض اللہ کی صفت ہے۔ تو پھر لاؤڈ سپیکر کے ذریعے آواز پہنچانے کے کیا معنی۔

انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام پر چاہے تو ایک آن میں ساری کائنات کھول دے چاہے تو ایک چھوٹی سی بات پر پردہ کر دے۔ اس کا اپنا کام ہے۔ نبی کا شان تو بہت بلند ہوتا ہے کوئی لمحہ کسی ولی پہ بھی آتا ہے کہ وہ ساری کائنات پہ نگاہ کرے لیکن یہ علم غیب نہیں اور یہ دائمی نہیں ہوتا وہ جب چاہتا ہے حجاب ہٹا دیتا ہے۔ جس بات سے چاہتا ہے حجاب نہیں ہٹاتا لیکن اللہ کا علم دائمی حضوری ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔

اور اگر حاضر ناظر نہ ہوں اور یہ سمجھا جائے کہ ہماری یہ چیخ و پکار روضہ اطہر پہ پہنچ رہی ہے تو یہ ویسے خلاف عقل ہے تقاضائے محبت تو یہ تھا کہ عمر بیت جاتی کونوں میں گوشوں میں اور کبھی صلوۃ وسلام سے زبان رکتی نہیں دل تھکتا نہیں اور دوسرا سنتا نہیں یہ تو جس سے بات ہو رہی ہے اسے سناؤ۔ سلامتی کی دعا آپ اللہ کریم سے کر رہے ہیں اللہ جانے اللہ کا حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانے۔ آپ اپنی حاضری لگوائیں۔ آپ اپنے رب کریم سے بات کریں جو سن رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے جو روزمرہ ہمارے ماحول میں ہمارے اردگرد موجود ہے مثلاً" رمضان المبارک کے مہینے میں اتنی رسومات ادا کی جاتی ہیں کہ آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے یا خدا یہ اسلام ہے یا تماشا ہے۔ اور اس قدر اسی میں زیادتی ہوتی ہے کہ ہر بات پہ ایک رسم، ہر دن پہ ایک رسم، ہر رات کے ساتھ ایک رسم، یہ تو ایک کاروبار بن گیا ہے۔ کھانے پینے کے بہانے بن گئے ہیں عیش کرنے کے ذرائع بن گئے ہیں یہ سب کچھ اتباع میں نہیں ہوتا۔

اتباع کی قید ہے پیچھے چلنے کی اور پیچھے چلنے والے کو ساری عمر یہ تحقیق کرنا پڑتی ہے کہ کہیں کوئی قدم بھی غلط نہ پڑ جائے دور حاضرہ میں جو حیثیت علمی مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی ہے وہ بہت ہی بے نظیر ہے یوں تو بے شمار اللہ کے مقبول بندے ہیں۔ لیکن

ہر گل را رنگ و بوئے دیگراست

مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو بے شمار فنون میں حتی کہ دین کے جتنے شعبے ہیں، دنیا کے جتنے شعبے ہیں ہر شعبے میں آپ کی تصانیف سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ متقدمین کی نظیر ہیں آپ لیکن بے شمار ایسی باتیں ملیں گی جہاں انہوں نے رجوع فرمایا اور لکھا کہ میرا خیال ایسا تھا فلاں عالم نے مجھے یہ یہ بات بتلائی تو حق یہی ہے کہ یہی ٹھیک ہے میں اپنے سے رجوع کرتا ہوں اور جتنے لوگوں نے مجھ سے سنا ہے انہیں بھی چاہئے کہ وہ رجوع کر لیں۔ یہ ہوتا ہے اقتدار پیچھے چلنا اس بات کا اسیر نہ ہو جائے کہ میں نے کہہ دیا کہ بھئی تیری کیا حیثیت ہے میری کیا حیثیت ہے میں نے کہہ دیا آپ نے کہہ دیا اس کی کیا حیثیت ہے ہونا تو یہ چاہئے جو

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمادیا۔
تو پیچھے چلنے کا اثر یہ ہوتا ہے فرمایا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ وہ لوگ جو عقائد میں اس طرح کھرے ہوں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم فرمائے ہیں۔
اور ان ارشادات کے مطابق کام کریں چونکہ ہر عمل کی صلاحیت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق ہو جو عمل آپ کی منشا کے خلاف ہے اس میں کوئی صلاحیت نہیں رہتی۔ فرمایا اگر کوئی محنت کر کے کوشش کر کے اپنے عقائد اور اعمال کو اس سانچے میں ڈھالے تو اللہ فرماتا ہے پھر یہ میرا کام ہے لَنُدْخِلَنَّھُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ۔ پھر میں اسے اپنے بندوں میں داخل کر لیتا ہوں پھر اسے جو کیفیات چاہیں میں عطا کر دیتا ہوں جو آگ اس کے دل میں بھڑکنی چاہئے میں بھڑکا دیتا ہوں جو طلب جو پیاس اس کی ضرورت ہو میں اس تک پہنچا دیتا ہوں یہ ایک بہت مضبوط اثر ہے اللہ سے تعلق قائم کرنے کا ہمارا اعمال اور ہمارے کردار میں۔
لیکن ہماری بد نصیبی یہاں پھر آڑے آتی ہے مذاہب باطلہ کا فلسفہ اگر آپ دیکھیں تو ہر مذہب نے اللہ کو مانا ہے یہ مجبوری ہے ہر مذہب کی خواہ وہ کتنا جھوٹا کتنا نقلی، کیسا بھی ہے لیکن اس کی یہ مجبوری ہے کہ وہ کسی نہ کسی درجے میں ایک آخری طاقت کو مانے خواہ اس کا کوئی بھی نام ہو حتیٰ کہ مذہب کا انکار کرنے والوں نے بھی اللہ کو مانا ہے انہوں نے زمانے اور دہر کے نام سے مان لیا دہریے کہلائے لیکن ایک طاقت تو انہیں بھی ماننا پڑی جو آخری ہے اور جو فاعل ہے اور جو سارے کام کرتی ہے چلو انہوں نے اس کا نام دہر یا زمانہ رکھ لیا لیکن ایک طاقت تو ماننا پڑی انہوں نے اپنے انداز سے مانا۔ اسلام کی آمد سے پہلے اس سرزمین پاک و ہند میں یا برصغیر میں چھتیس کروڑ دیوی دیوتاؤں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جب یہاں اسلام آیا تو اس سے پہلے کے دور میں چھتیس کروڑ کی آبادی نہ تھی اس میں لیکن جن دیوی یوتاؤں کو پوجا جاتا تھا ان کی تعداد چھتیس کروڑ تھی اس کے باوجود وہ مہادیو ایک بہت بڑا دیوتا کو بھی مانتے تھے جو سب سے بڑا ہے اکیلا ہے جس جیسا کوئی نہیں یعنی چھتیس کروڑ شریک مان کر پھر بھی انہیں اللہ کو ماننا پڑتا تھا یہ مجبوری ہوتی ہے ہر ایک کی وہ ماننا تو کوئی ماننا نہ ہوا ماننا تو یہ ہے ایمان تو یہ ہے کہ جو صفات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائیں جو کیفیات ذات کے بارے جو عقیدہ ذات کے بارے ارشاد فرمایا جو عقیدہ صفات کے بارے میں ارشاد فرمایا وہ مانا جائے یعنی اللہ کو ماننا وہ ماننا ہے اور فقہاء اس کی بڑی عجیب تشریح کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں میں اس رب کو ماننا ہوں آدمی کا ایمان یہ ہونا چاہئے بچے کو یہ سکھانا چاہئے کہ میں اس رب کو مانتا ہوں جس کو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو حضرت عبداللہ کے بیٹے تھے مکہ میں پیدا ہوئے ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئے اللہ کے آخری رسول تھے جس طرح اور جیسا وہ منواتے ہیں میں اس طرح اور ویسا اپنے رب کو مانتا ہوں یعنی اس پوری قید کے ساتھ مانا جائے اسی طرح اعمال میں بھی ہر عمل کو اس سند کے ساتھ کیا جائے۔
لیکن یہاں بدقسمتی یہ آڑے آتی ہے کہ یہ جو مذاہب باطلہ اپنے طور پر مانتے بھی ہیں انہوں نے عبادات کو دنیوی زندگی میں ملنے کا ایک نظریہ پیش کیا ہے اسی لئے لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں آخرت کی انہیں خبر نہیں۔ عذاب و ثواب سے وہ واقف نہیں۔ دائمی زندگی کو وہ جانتے نہیں چونکہ آخرت اور دائمی زندگی قیامت حشر نشر جنت دوزخ یہ سب علوم غیبیہ ہیں اور اللہ اپنے غیب کے علوم پر اپنے نبیوں کو مطلع فرماتا ہے اور نبی ان لوگوں تک یہ بات پہنچاتے ہیں جو ان کو مانتے ہیں۔ اب جس کا تعلق کسی نبی سے نہیں ہے اس کے پاس آخرت کا کوئی تصور بھی نہیں۔ تو پھر کیا کریں جو رسومات مذہب کے نام پر بناتے ہیں ان کا بدلہ کیا دیں پھر وہ لوگوں کو دنیوی انعامات کا لالچ دیتے ہیں یہ رسم کرنے سے عمر بڑھتی ہے یہ رسم کرنے سے اولاد بڑھتی ہے یہ رسم کرنے سے رزق بڑھتا ہے وغیرہ وغیرہ
ہماری بد نصیبی بھی یہ ہے کہ اللہ کریم نے تو عقائد،

عمل کا اجر یہ رکھا کہ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ۔ کہ میں ان کو اپنے صالح اپنے چاہنے والوں میں داخل کر لیتا ہوں لیکن ہماری بد نصیبی یہاں بھی آڑے آتی ہے کہ ہم اگر دو دن سجدہ دے بیٹھیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نوکری لگ جانی چاہئے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں ہم روزے رکھتے ہیں ہماری صحت خراب نہیں ہونی چاہئے ہم اللہ اللہ اتنی کرتے ہیں تو ہمارے کاروبار میں ترقی ہونی چاہئے وہ فلسفہ جو مذاہب باطلہ نے انجیکٹ کیا ہے انسانی ذہنوں میں ہم اس کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بیماری کے لئے صحت کی ضرورت' بھوک کے لئے پیٹ بھرنے کی ضرورت' دنیا میں رہنے کے لئے عزت و آبرو کی ضرورت' روزگار کی یہ ساری ضرورتیں ہیں اور یہ ساری ضرورتیں ہمیں اللہ کریم سے مانگنی ہیں اور اللہ کی عبادت کرنے سے ان سب میں فائدہ بھی ہوتا ہے لیکن یہ ساری ضرورتیں عبادت کی شرط قرار نہیں دی جا سکتیں۔

عبادت کی شرط صرف ایک ہے اور صرف ایک معیار اس کو جانچنے کا کہ کون سے سجدے نے مجھے اللہ کے کتنا قریب کر دیا کون سے عمل نے میرے دل میں اللہ کی طلب پیدا کر دی کون سے وظیفے نے میرے دل میں اللہ کی محبت بڑھا دی۔ عبادات کا اجر اسلام میں قرب الٰہی ہے یہ معمولی چیزیں نہیں یہ تو اللہ کریم فرماتا ہے میں نے جسے بھی پیدا کیا ہے اس کی روزی میرے ذمے ہے میرا ٹھیکہ ہے میری مخلوق ہے وہ اچھا ہے یا برا ہے وہ نیک ہے یا بد ہے وہ مومن ہے یا کافر ہے خوبصورت ہے یا بدصورت ہے۔

مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ کوئی بھی جسے کھانے کی ضرورت دی گئی ہے فرمایا اس کا کھانا پہنچانا یہ میرا ٹھیکہ ہے میرا ذمہ ہے میں رب ہوں اور میری مخلوق ہے اسے دینا میرا کام ہے۔

تو یہاں فلسفہ عمل یہ ہے کہ کونسا عمل ہمارے دل میں کتنی طلب الٰہی کتنی قرب الٰہی کی طلب پیدا کرتا ہے اور اگر یہ نہ ہو اگر پریشانی آئے ذرا کسی کو چھینکیں آ جائیں تو وہ کہتا ہے آج میں نے نماز نہیں پڑھی طبیعت خراب ہے اور زندگی کے جتنے کام ہیں وہ پوچھو تو سب کر لئے ہیں دفتر بھی گیا ہو گا کھانا بھی کھایا ہو گا لوگوں سے ملا بھی ہو گا سارے کام زندگی کے لیکن طبیعت خراب ہے اللہ کی عبادت چھوٹی یہ اس طبیعت کی خرابی کا سارا اثر دین ہی پر پڑا۔

اللہ کریم فرماتے ہیں لوگ دعویٰ ایمان تو کرتے ہیں اس کے لئے اپنے آپ کو پیش تو کرتے ہیں لیکن۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ۔ لوگ بڑے دھڑلے سے کہتے ہیں ہم تو اللہ کو ماننے والے ہیں ہم مسلمان ہیں ہم اللہ کے خادم ہیں ہم اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت رکھتے ہیں لیکن فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ۔ اللہ کی راہ میں اگر کچھ مصیبت آ جائے جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ۔ تو انہیں لوگوں کی طرف سے وہ پیش آنے والی پریشانی اتنی بھاری لگتی ہے جیسے اللہ کا عذاب آ گیا اور پھر اس حال میں وہ دعویٰ محبت وہ دعویٰ اسلام اس پر عمل اس کے تقاضے یہ سار بھول بھال کر اس سے بچنے کے لئے بھاگے پھر رہے ہوتے ہیں نہ انہیں اللہ یاد ہوتا ہے نہ اللہ کی محبت نہ اللہ کا حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نہ اس کے احکام نہ عبادت اور نہ اس کے اوقات نہ جائز اور نہ ناجائز کی پرواہ نہ حلال اور حرام کی فکر بلکہ انہیں ایک ہی فکر ہوتی ہے کہ اس مصیبت سے میں اپنی جان نکالوں۔ ایسی فکر کرتے ہیں جیسے اللہ کے عذاب سے جان بچانے کے لئے بھاگ دوڑ کرنی چاہئے کتنی شدت سے بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔

وَ لَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ۔ فرمایا میرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیرے پروردگار کی مدد پھر ان کی دستگیری فرما لے۔ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ۔ تو کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم تو آپ کے خادم ہیں۔ یعنی اگر وہ مصیبت ٹل جائے تو پھر وہ وہیں آجاتے ہیں جی ہم عاشق ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم مسلمان ہیں۔ ہم محبت کرنے والے ہیں اللہ سے اللہ کریم فرماتا ہے۔

اَوَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِیْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِیْنَ۔
ایسے لوگ بے وقوف ہیں یہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اللہ دلوں کے بھید جانتا ہے کس سے جھوٹ بول رہے ہو؟ کس سے بات کر رہے ہو؟ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ وہ لمحے' وہ کیفیات' وہ خوف و ہراس' وہ لرزہ جو تمہارے دل پر گزرا کیا وہ اللہ کی نگاہ سے اوجھل تھا؟ وہ دیکھ رہا تھا وہ دل کی گہرائیاں' تمہارے دل کی گہرائیاں اس کے سامنے تو عیاں ہیں واضح ہیں اور یہی تو انسانیت کی آزمائش ہے وَ لَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ۔ یہی تو اس دنیا میں پرکھا جا رہا ہے کہ کون کھڑا ہے اپنے وعدے میں اور کون منافق ہے کہ فائدہ ملتا رہے تو دین دار بھی ہے دین بھی ہے ذرہ بوجھ پڑے تو سب سے پہلے دین کو چھوڑ بیٹھتا ہے منافقت یہ ہے کہ دینوی فائدے کے لئے دین کو اپنایا جائے اور دینوی نقصان سامنے آئے تو دین سے کنی کترا جائے یہ منافقت کی بہت بڑی پہچان ہے یعنی دین کے لئے دنیا کا کچھ قربان کرنے کو تیار نہ ہو

تو اللہ کریم فرماتے ہیں یہی تو آزمائش ہے پرکھ ہی یہی ہے انسان کی انسان کو اختیار ہی اتنا دیا گیا یہ عجیب مسئلہ ہے اس پر علماء نے بہت کچھ لکھا ہے مفسرین نے بھی محدثین نے بھی اور بڑی جرح کی ہے ایک عجیب سا قول حضرت علی کرم اللہ وجہ کی طرف منسوب فرماتے ہیں علماء مفسرین کہ کسی نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا انسان کا اختیار کتنا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ایک پاؤں اٹھا لو تو اس نے اٹھا لیا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا دوسرا بھی اٹھا لو تو نہیں اٹھا سکتا فرمایا بس اتنا ہی ہے لیکن میرے خیال میں یہ روایت درست ہے یا نہیں کیونکہ یہ قول وضاحت نہیں کرتا اصل سوال کی۔

انسان کے پاس بہت بڑا اختیار ہے اور انسان بے بس بھی ہے۔ بے بس ایسا ہے کہ نہ اپنی مرضی سے پیدا ہوتا ہے نہ اپنی مرضی سے مر سکتا ہے نہ اپنی مرضی سے اپنا رنگ اور حلیہ پسند کر سکتا ہے نہ اپنی مرضی سے اپنی شکل و شباہت قد کاٹھ بنا سکتا ہے نہ اسے رزق کے معاملے میں کوئی اختیار دیا گیا ہے کہ اپنے لئے پسند کرے نہ اسے اقتدار کے معاملے میں کچھ بھی تو نہیں جس طرح سارے ذرات خاکی تقدیر کے دھارے میں بہہ جا رہے ہیں جس طرح درخت اور پتے جس طرح بادل اور ہوائیں جس طرح زمین آسمان کی باقی مخلوق اسی طرح تقدیر کے دھارے میں ہر آن یہ بہتا رہتا ہے۔

اختیار کیا ہے بھلا اختیار یہ ہے کہ اسے اللہ نے دل دیا ہے اور اس کا دل محبت کرنے کا جذبہ رکھتا ہے شعور رکھتا ہے اسے اللہ نے دل کی وہ دور رس نگاہ دی ہے کہ یہ ان چیزوں کی ظاہری چمک کے پیچھے ان کی اصلیت اور حقیقت کو جھانک سکتا ہے اس سے بھی آگے بڑھ کر ان چیزوں کو بنانے والے قادر مطلق کے جمال تک اس کے دل کی نگاہ پہنچتی ہے پھر اسے اختیار یہ دیا گیا اور بہت بڑا اختیار اس کے پاس یہ ہے کہ یہ اپنے لئے دنیا کی لذتیں' فانی راحتیں اور یہ فانی چیزیں پسند کرتا ہے یا یہ اپنے لئے اس کے قرب کا طالب ہے خواہ ساری دنیا مل جائے تو بھی اس کا قرب ملنا چاہئے اور ساری دنیا چھن جائے تو بھی اس کا قرب ملنا چاہئے قرب کو پانا اس کے بس کی بات نہیں ہے لیکن یہ فیصلہ اسے کرنا ہے اسے کیا چاہئے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں جو دنیا کو پانے کا فیصلہ کرتا ہے نُؤْتِہٖ مِنْھَا اسے ہم دنیا سے کچھ دے ہی دیتے ہیں کہ آخر ہماری مخلوق ہے اس نے اگر سب کچھ میری جیسی خود میری ذات کو چھوڑ کر اگر یہ بے چارہ دنیا کی طرف لپکا ہے تو پھر چند نوالے دے دو۔

لیکن اگر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے اللہ کا قرب چاہئے تو فیصلہ کرنا اس کا کام ہے قدم اٹھانا اس کے ذمے ہے اسے پکڑ کر اپنی بارگاہ تک لے جانا فرمایا یہ ہمارا ذمہ ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ جو بھی یہ فیصلہ کر کے میری طرف بڑھنے کی جدوجہد کرتا ہے ایک نہیں سینکڑوں راستے میں اس کے لئے کھول دیتا ہوں اسے مجلس بھی صالحین کی دے دیتا ہوں مشورہ دینے والے بھی مخلص لوگ

دے دیتا ہوں اسے مجلس بھی صالحین کی دے دیتا ہوں مشورہ دینے والے بھی مخلص لوگ دے دیتا ہوں سکھانے پڑھانے والے بھی اپنے نیک لوگ دے دیتا ہوں مجھ پر پہنچانے کے بے شمار سبب جو ہیں وہ میں اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہوں۔ اس کا اہتمام کر دیتا ہوں کہ وہ بخریت تمام میری بارگاہ میں پہنچ جائے۔

یہ بہت بڑا فیصلہ انسان خود کرتا ہے یہ اتنا بڑا فیصلہ جس کے بارے ارشاد ہے کہ ہم نے ارض و سما پر' بڑے بڑے پہاڑوں پر یہ امانت پیش کی کہ اپنے آپ کو اس آزمائش میں ڈالتے ہو؟ کیا تم دنیا اور دنیا کی لذتوں' نعمتوں اور اس کے مقابلے میں عشق الٰہی کی تپش کو آزمانا چاہتے ہو ---- انہوں نے کہا اللہ ہمیں معاف کر ہم تیرے معاملات میں اپنے آپ کو قابل نہیں پاتے کہ جن معاملات کا تعلق تیری ذات سے ہو تو حکم تک ہماری استطاعت ہے تیری حکم کی تعمیل کے پابند ہیں اور یہی ہمارے لئے کافی ہے۔

وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ انسان نے کہا اللہ میں اس ازمائش میں اتروں گا۔ ٹھیک ہے مانگ کر لی ہے تو اس کا حق ادا کرے اللہ فرماتے ہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ یہ بے وقوف بھی تھا اور جلد باز بھی اس نے سوچا نہیں اس نے سمجھا نہیں اب جب دنیا میں آیا تو اسے ہر چیز دنیا کی میٹھی میٹھی لگتی ہے انہیں چھوڑ کر ادھر آنا پڑے تو اسے کوفت ہوتی ہے پھر یہ اس طرف غرق ہو کر تباہ ہو جاتا ہے اور یہ کتنا بڑا جرم ہے کہ جب ایک مخلوق اپنے مالک سے کہہ کر میدان میں اتری یہ دعویٰ لے کر زمین پہ وارد ہوا کہ بارالہا زمین اور اس کی نعمتیں تو معمولی شے ہیں تو ساری جنتوں کو بھی زمین پہ پھینک دے مجھے نہیں باندھ سکیں گی میں تیری ہی طرف بڑھتا رہوں گا۔ آج پھر کیوں ایک ایک ٹکڑے پہ رک جاتا ہے آج پھر کیوں ہر سجدے پہ کچھ دنیا کی نعمتیں ہی مانگتا ہے آج پھر کیوں تھوڑی سی تکلیف آنے پہ اس طرف کا راستہ بھول جاتا ہے اور دین چھوٹ جاتا ہے اللہ کی طلب سرد پڑ جاتی ہے اور اگر ایسا کرے گا تو پھر ظاہر ہے اس کا نتیجہ اللہ سے دوری کی صورت میں نکلے گا۔

تو یہ ایک بڑی آسان سی بات ہے کہ ہمارے عقائد ہمارے کردار میں ایک تاثیر رکھ دی گئی ہے ایک اثر و دیعت فرما دیا گیا ہے کہ دونوں راستے کشادہ ہیں اب کسی کو اللہ کی محبت نصیب ہو جائے اور وہ اسے اطاعت پہ مجبور کر دے جیسا کہ ابتدائے اسلام میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ ہوا تھا کہ صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عشق الٰہی کامل نصیب ہو گیا اب اس عشق نے انہیں باندھ کر وہاں کھڑا کر دیا کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے ہم تو وہی کریں گے جو ہمارا رب فرماتا ہے۔ بہت آسان بہت سیدھا بہت مختصر راستہ یہ ہے کہ کوئی ایسی ہستی مل جائے جو پر تو جمال حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنا سینہ روشن رکھتی ہو اور کچھ تھوڑی سی رمق کچھ تھوڑا سا شمہ اس عشق کا اس محبت کا اس پر تو جمال کا ہمارے دل میں بھی آجائے اور وہ ہمیں مجبور کر دے اللہ کی اطاعت پر یا پھر ہم اپنے آپ کو باندھ کر کھڑا کر دیں اللہ کی اطاعت پر اور ہمارا کھڑا ہونا جو ہے اس کے عوض اللہ ہمیں اپنا عشق عطا کر دے۔ یہ دو طریقے ہیں دو راستے ہیں۔

ایک تو بہت بڑی خوش نصیبی ہے جیسے صحابہ کرام کو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات نے وہ جذب اور لذت عطا کی تو وہ موت و حیات سے بالاتر ہو گئے بلکہ اللہ کی راہ میں مر کر وہ نعرہ لگاتے تھے **فزت برب کعبہ** رب کعبہ کی قسم میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور پھر ایک نہیں پوری تاریخ بھری ہوئی ہے۔ جس کا ماحاصل یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں موت تک کو تلاش کرتے ہیں یعنی مال کا دینا اولاد کا دینا سہولیات کا دینا اس کو چھوڑ کر جان دینے کے لئے بھی وہ پھرا کرتے تھے دیوانہ وار۔

حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خط ایرانی جرنیل رستم کو لکھا جس میں اسے دعوت دی تھی کہ اسلام قبول کر لو بہتر ہے ورنہ اگر تم لڑنا ہی چاہتے ہو تو میرے ساتھ ایک

عجیب قوم ہے۔ اِنَّ مَعِیَ قَوْمًا یُحِبُّوْنَ الْمَوْتَ کَمَا یُحِبُّوْنَ الْفَارِسُ الْخَمْرَ۔ جس طرح تمہاری ایرانی سپاہ شراب کی شیدائی ہے میرے یہ جانفروش اس سے زیادہ محبت موت سے رکھتے ہیں وہ اس کے متلاشی ہیں تم لڑ نہیں سکو گے بڑا عجیب جملہ انہوں نے لکھا تھا۔ یُحِبُّوْنَ الْمَوْتَ کَمَا یُحِبُّوْنَ الْفَارِسُ الْخَمْرَ۔ جس طرح تمہاری ایرانی سپاہ شراب پہ ٹوٹتی ہے یہ اس سے زیادہ بے تابی کے ساتھ موت کے متلاشی ہیں تو آخر کیوں دیوانے ہو گئے تھے کیا ہم نمازیں پڑھتے ہیں عمر بڑھانے کو اور وہ پڑھتے تھے جان دینے کو یہ فرق ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ وہ سب کچھ ہار کر اس منزل گاہ عشق میں قدم رکھنا چاہتے تھے جہاں وہ ہوں اور اللہ کا جمال ہو اور یہی عشق کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اسے محبوب کے سوا کچھ نہیں چاہئے ہوتا اور انہیں تو یہ ایک لمحے میں، محبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نصیب نہیں ہوئی تو انہوں نے اطاعت کا حق اتنا ادا کیا کہ ان کے دل بھی اس عشق کی آگ میں جلنے لگے وہ منصب صحابیت کو تو نہ پا سکے لیکن عشق الٰہی کو انہوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر پا لیا۔

تو اگر جذبہ بھی صادق نہ ہو عمل اور کردار بھی صحیح نہ ہو عقائد بھی رسومات کی زد میں ہوں تو باقی بچت کیا ہے پھر زیادتی یہ ہے کہ ہم ساری عمر اس پر مطمئن رہتے ہیں کہ جو کچھ میرے پاس ہے یہی اسلام ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر مسجد کا اسلام الگ ہر محلے کا اسلام الگ ہر ایک گھر میں تین تین طرح کے اسلام ہیں۔ بزرگوں کا اسلام الگ ہے اولاد کا اسلام اور طرح سے ہے باہر سے آنے والے مہمانوں کا اسلام ایک اور طرح سے ہے یعنی جو جس طرح اپنی پسند ہے کسی کی اس طرح کی سوچ اور اس طرح کے عمل کو اسلام بنا لیا گیا ہے اور یہ قطعاً" کبھی بھی نہ صحیح ہے اور نہ مفید اسلام وہی ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم فرمایا وہی اعمال صالح ہیں جن کی سند بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتی ہے اور وہ اعمال مرتب ہوتے ہیں عشق پر اور عشق مرتب ہوتا ہے ان اعمال پر یہ تو قانون فطرت ہے کہ ہر چیز کا ماحاصل بھی وہی ہوتا ہے جو اس کا بیج بنتا ہے۔ آپ سارے آم کے پراسس کو دیکھیں درخت پر تنا اس پر بیج لگا اس پر پھل لگا کھانے پینے کے بعد ایک بیج ایک گٹھلی حاصل ہوئی وہی گٹھلی ایک پورا آم پھر دے سکتی ہے اسے دبا دو آم نکل آئے گا۔ آم کا پیڑ لگا دو اس پر وہی پھل آ جائے گا آپ دانہ دبا دو تو اس پر پودا نکل آئے گا پھر پودے پر کیا ہو گا آخر میں وہی دانے لگیں گے۔ تو عمل محبت پہ استوار ہوتا ہے یا عمل سے محبت پیدا ہو جاتی ہے لیکن عمل بھی خالص ہو عقیدہ بھی کھرا ہو۔

اور اگر ہم ساری زندگی اس کی صلاحیت یا اس کے کھرے پن کو جانچنے کی کوشش ہی نہ کریں ماحول کچھ رسومات ہمیں دے دے انہیں کو اسلام سمجھ لیں تو یہ اپنے آپ کے ساتھ زیادتی ہے یہ کسی پر فتویٰ لگانے والی بات نہیں ہر شخص کو اختیار حاصل ہے اس کا اپنا معاملہ ہے اپنے رب کے ساتھ اور خود اسے چاہئے کہ وہ ان اعمال کی ان خیالات کی تحقیق کرے جو اس کے پاس ہیں۔

اللہ کریم ہمیں صحیح عقیدہ اور خالص عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری خطاؤں پہ درگزر فرمائے ہمارے ٹوٹے پھوٹے اعمال کو اور ہمارے ایسے کردار کو جو اس کی بارگاہ کے قابل نہیں ہیں اپنے کرم سے قبول فرمائے کوتاہیوں اور لغزشوں کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع آپ کا عشق اپنی ذات کی محبت نصیب فرمائے۔

سب سے پہلے اپنے وجود کو
اسلامی ریاست بنائیے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ

مولانا محمد اکرم اعوان

اسلام نے انسان کی زندگی کے ہر پہلو کو ایک انقلاب آفرین تبدیلی سے روشناس فرمایا اور اس کے نتائج اخروی کامدار تو اخروی مشاہدات پر یا آخرت میں پہنچ کر سامنے آنے پر کسی کے علم میں آ سکیں گے یا ایمان پر ہے لیکن اس کے جو نتائج دنیا میں ظاہر ہوئے وہ تاریخ کا حصہ بھی ہیں اور ایک عالم پہ آشکارہ بھی ہیں۔ انسانی مزاج یہ تھا افراد ہوں یا اقوام وہ اپنے نفع و نقصان کو اپنے اعمال کے نتائج اور اثرات کو اپنے کردار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ردعمل کو دنیوی نتائج کی روشنی میں دیکھنے کے عادی تھے اور عادی ہیں کوئی بھی انسان کھیت میں ہل چلاتا ہے تو اسے لہلہاتا ہوا دیکھنے کے لئے اس میں فصل کو دیکھنے کے لئے۔ کوئی بھی انسان مزدوری کرتا ہے تو اجرت پانے کے لئے۔ کوئی انسان دنیا کا کوئی کام کرتا ہے تو اس سے وہ فوری نفع کی امید رکھتا ہے۔ اسلام نے اس میں ایک عجیب تبدیلی فرمائی ہے۔ اسلام نے ہر کام کو دنیا سے اٹھا کر آخرت کے حوالے سے دیکھنے کی تاکید فرمائی اور اس پہ اصرار کیا قرآن حکیم میں فرمایا۔

وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ کہ ایسے لوگ جو اس کتاب پہ ان احکام پہ یقین رکھتے ہیں جو آپ پر نازل فرمائے گئے اور جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے نازل ہوا اس سب پر بھی ایمان اور یقین رکھتے ہیں اور آخرت کا ایمان اور آخرت پہ یقین بھی اسی ایمان اور اسی یقین کا ایک جزو تھا لیکن اسے اتنی اہمیت دی کہ پھر سے الگ سے ارشاد فرمایا وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ اور آخرت پر وہ بہت پختہ یقین رکھتے ہیں۔ آخروی یقین کی یہ ابتدائی صورت ہے کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آخرت ہے اور آخرت میں ہر عمل کا بدلہ دیا جائے گا اور ہمیں اللہ کے روبرو جواب دینا ہے یہ ایک انتہائی ابتدائی صورت ہے ماننے کی۔ جس یقین کا مطالبہ قرآن حکیم کرتا ہے وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ کہ آخرت پر ان کا پختہ یقین ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جو کام بھی وہ کرتے ہیں جو بات منہ سے نکالتے ہیں جو قدم اٹھاتے ہیں اس کے اخروی نتیجے پہ ان کی نگاہ ہوتی ہے اور انہیں یقین ہوتا ہے کہ آخرت میں اس پر یہ نتیجہ مرتب ہو گا۔ اب اس نتیجے کو جاننے کے لئے اس بات کو سمجھنے کے لئے چونکہ آخرت ہمارے عقل کی حدود سے بہت دور ہے ہماری ظاہری نگاہ کی رسائی سے بہت پرے ہے تو اس درمیانی فاصلے کو کس دوربین سے دیکھا جائے یہ دوربین ہے ذات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنہوں نے ایک چھوٹے سے چھوٹے اور چھوٹی سے چھوٹی بات سے لے کر زندگی کے بہت بڑے بڑے معرکوں تک ہر کام کا اسلوب اور اس انداز سے کئے جانے پر اس پر مرتب ہونے والا نتیجہ۔ یقینی انداز میں بتا دیا۔

ہمارے ہاں غیر پڑھے لکھے لوگوں میں جنہیں پڑھنا لکھنا نصیب نہیں ہوا ان میں ایک بڑا عجیب محاورہ ہے جو اکثر سنا گیا ہے۔

"کہ آخرت کو کس نے دیکھا ہے اور کون پلٹ کر آیا ہے کہ وہ بتائے وہاں یہ کچھ ہوتا ہے"

لیکن حق یہ ہے کہ جتنے لوگ گزر چکے ہیں انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اگر یہ سارے بھی پلٹ آئیں تو ان کے بتانے میں پھر بھی غلطی ہو سکتی ہے ان کے تجربے میں پھر بھی انہیں دھوکا لگ سکتا ہے ان کے بات پہنچانے میں ان سے مفہوم تبدیل ہو سکتا ہے لیکن جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا ۔ وہ کسی پلٹ کر آکر بتانے والے سے کروڑوں گنا سچا صحیح اور خالص اور کھرا ہے یعنی اگر کوئی قبر سے اٹھ کر آجائے اور وہ یہ بتائے کہ مرنے کے بعد یہ کچھ ہوتا ہے میں اس تجربے سے گزرا ہوں تو اسے غلطی لگ سکتی ہے یا ہمیں سمجھانے میں وہ ٹھوکر کھا سکتا ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ سمجھنے میں ٹھوکر کھائی نہ سمجھانے میں ٹھوکر کھائی۔

یہ وہ بنیادی تبدیلی تھی جس نے مسلمان کی نگاہ کو بہت زیادہ وسعت دے دی اتنی کہ غیر مسلم اسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مثلاً" ہم کاروبار کرتے ہیں وقتی طور پر نفع کمانے کے لئے لیکن مسلمان کاروبار اس انداز سے کرتا ہے کہ وقتی نفع تو مقصد ہے لیکن اگر وقتی طور پر نقصان بھی ہو جائے تو جو نتیجہ آخرت میں مرتب ہونا ہے اس میں نقصان نہ ہو۔ اسی طرح زندگی کے سارے امور کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے حتی کہ زندگی اور موت کے متعلق مسلمانوں کا تصور یکسر بدل گیا۔

حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رستم کو ایرانیوں کے ساتھ آخری فیصلہ کن معرکے میں ایک خط لکھا تھا اس میں یہی بات لکھی تھی اور یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بہتر ہے تم توبہ کر لو ہمارے ساتھ ہمارے برابر کے دینی بھائی بن جاؤ اور وہی حقوق تمہیں حاصل ہوں جو مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں اگر تمہاری قسمت میں یہ سعادت نہیں ہے تو تم جزیہ دے کر اپنی سلطنت اپنی ریاست اپنا ملک اپنی جان اپنا سب کچھ بچا لو زمین اللہ کی ہے اس پر قانون اللہ کا ہو گا مخلوق اللہ کی ہے اس پر حکمرانی اللہ کی ہو گی اگر تمہیں یہ بھی پسند نہ ہو تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آخری جملہ یہ لکھا تھا کہ

اِنَّ مَعِیَ قَوْمٌ یُحِبُّوْنَ الْمَوْتَ کَمَا یُحِبُّوْنَ الْفَارِسُ الْخَمْرَ۔ کہ میرے ساتھ ایسے لوگ ہیں جس طرح تمہاری ایرانی سپاہی شراب کو تلاش کرتے پھرتے ہیں اس سے زیادہ یہ موت کی جستجو میں گھوما کرتے ہیں یعنی لوگ جان بچانے کے لئے زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں اور یہ جان دینے کے لئے موت کو کرتے ہیں۔ اس لئے کہ صرف اسلام نے وہ نگاہ دی وہ وسعت دی نگاہ کو' وہ وسعت نگاہ دی مسلمان کو کہ وہ زندگی اور موت کے بھی اس نتیجے کو دیکھتا ہے جو آخرت میں مرتب ہو گا۔

منافقین نے جھوٹ بول کر کچھ اکابر صحابہ رضوان رضی اللہ تعالیٰ عنہ' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دین سیکھنے کے بہانے حال کئے ان سے دھوکا کیا شہید کر دیئے اور یہ بہت بڑا دھوکا تھا بہت بڑی زیادتی تھی پھر گرفتار کر کے مکہ والوں کے ہاتھ بیچ دیے بہت لمبا قصہ ہے آپ نے پڑھا بھی ہو گا سنا بھی ہو گا۔ اس سارے واقعہ میں ایک بڑا عجیب واقعہ آتا ہے کہ ان منافقین میں سے ایک شخص جس نے ایک مسلمان صحابی کو شہید کیا تھا وہ سیدھا وہاں سے مدینہ منورہ کو چل پڑا اسے اس کے ساتھی نے پکڑا کہ تم پاگل ہو تم کہاں جاتے ہو اس نے کہا میں ان لوگوں کے پاس جاؤں گا ان کے نبی علیہ السلام کی خدمت میں جاؤں گا جانتے ہو کیا نتیجہ ہو گا ہم نے ان کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا اس نے کہا یہی ہو گا قتل کر دیں گے لیکن میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں ان سے یہ اجازت ضرور چاہوں گا کہ مجھے میری بات کا جواب دے دو اس کے بعد بے شک قتل کر دو اور وہ بات اتنی عجیب ہے کہ میں اسے ہضم نہیں کر سکتا۔ "کیا بات

ہے؟" تو کہنے لگا "بات یہ ہے کہ جس آدمی کے ساتھ میں لڑ رہا تھا مقابلہ کرتے کرتے میرا نیزہ اس کے سینے پر پڑا اور پسلیاں توڑتا ہوا پشت کی طرف نکل گیا اور آخری الفاظ جو اس شخص کی زبان سے نکلے وہ تھے فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ رب کعبہ کی قسم میں جیت گیا وہ کہتا ہے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی میں سمجھ رہا تھا میں جیت گیا ہوں لیکن یہ میں کیسے مانوں کے عرب کا سپوت بھی ہو مرد میدان بھی ہو اور نزع کے وقت وہ جھوٹ بولے اور رب کعبہ کی غلط قسم کھائے یہ تو نہیں ہو سکتا یہ تو عربوں کے مزاج کے خلاف ہے اور اگر اس نے قسم سچی کھائی ہے اور مرتے دم اور آخری سانس میں کھائی ہے اور رب کعبہ کی کھائی ہے تو وہ تو مر گیا پھر وہ جیت کیسے گیا؟ میں تو سمجھتا ہوں اسے شکست ہوئی وہ ہار گیا وہ مجھ سے ہار گیا زندگی ہار گیا اور وہ کہتا ہے رب کعبہ کی قسم میں جیت گیا تم یہ بات مجھے نہیں سمجھا سکو گے شاید وہ ہستی مجھے سمجھا سکے جس نے زندگی اور موت کا تصور تبدیل کر دیا ہے ان کے دلوں میں۔ یہ کیا عجیب بات ہے کہ ہم ساری زندگی زندگی بھر کے ایک لمحے کو ترستے ہیں کہ ہمیں چند منٹ مہلت اور مل جائے یہ کیسی عجیب قوم ہے کہ وہ موت کے منہ میں جاتے ہوئے کہتا ہے رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔" اور وہ واقعی اپنا یہ سوال لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوا اور اسی جملے نے اسے نور ایمان سے مشرف فرمایا کہ بحالت کفر اس کی سمجھ نہیں آتی اس کے لئے نور ایمان کی ضرورت ہے تم جب زندگی اور موت کو اس تناظر میں دیکھو گے کہ سر میدان کون کھیت رہا اس کا نتیجہ اور ہو گا اور اگر اس زندگی اور موت کو اس تناظر میں دیکھو گے کہ میدان حشر میں کون سرخرو ہوا تو نتیجہ مختلف ہو گا۔

تو اسلام نے جو سب سے بڑی انقلاب آفرین تبدیلی دی سارے تصورات حیات میں۔ ان میں ایک بہت بڑی تبدیلی اس نے اپنے ماننے والوں کی نگاہ کو یہ دی۔

حضرت مرزا جان جاناں سے ایک مرید نے عرض کیا کہ مجھے کوئی خدمت ضرور فرمایئے تو فرمایا تم سال میں دو دفعہ میرے پاس آتے ہو اگر تم میری خدمت کرنا چاہتے ہو تو ایک بار کم کر دو اور سال میں ایک بار آیا کرو حضرت یہ کیوں فرمایا تم کھانا بہت پیٹ بھر کر کھاتے ہو اور میں تمہیں دیکھتا رہتا ہوں تو میرا ہفتہ بھر معدہ خراب رہتا ہے۔ اس لئے تم اگر سال میں ایک بار آؤ تو مجھے ایک بار اس تکلیف سے نجات مل جائے گی تو اس قدر ان کے مزاج میں نزاکت تھی۔

بہادر شاہ ظفر آپ سے ملنے گیا تو اسے پانی پینے کی ضرورت ہوئی اس نے اٹھ کر صراحی سے خود ڈال دیا واپس جب گلاس رکھا تو ذرہ سا ٹھہرا تھا تو فرمایا بادشاہی کیا خاک کرو گے صراحی پر گلاس رکھنے کی تو تمیز نہ آئی تمہیں تم حکومت کر لو گے؟ اتنا بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔

ان کی اہلیہ جو تھیں وہ بڑی سخت مزاج تھیں سخت کلامی کرتی تھیں گالیاں تک دینے سے باز نہیں آتی تھیں ایک کابلی مرید تھا وہاں اللہ اللہ سیکھتا تھا اسے کسی کام سے آپ نے گھر بھیجا کہ گھر والوں سے فلاں چیز لے آؤ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے وہ حسب عادت بولیں کون ہے حضرت نے بھیجا ہے اس نے پانچ سات گالیاں حضرت کو دیں دس بارہ آنے والے کو دیں وہ بھی کابلی تھا وہ بھی بڑا چلایا باہر سے کہ گردن اڑا دوں گا یہ کر دوں گا وہ کر دوں گا تو آپ نے لوگوں کو دوڑایا جو شاگرد بیٹھے تھے کہ اس بے وقوف کو کیوں بھیجا اسے لے آؤ پکڑ کر تو کسی نے عرض کی حضرت آپ کے لئے تو اس خاتون کے ساتھ عمر بسر کرنا بہت بڑی آزمائش ہے یعنی جو آدمی غلط تلفظ برداشت نہ کر سکے وہ سخت کلامی یا بد زبانی کیسے برداشت کرے گا۔ آپ کے لئے تو بیویوں کی کوئی کمی نہیں لوگ فخر کریں گے کہ آپ کے ساتھ اپنی نسبت قائم کریں اگر کسی کا رشتہ قبول کریں آپ اور شادی کر لیجئے تو فرمانے لگے اس سے یہ ہو گا کہ میں اس دنیوی آزار سے بچ جاؤں گا لیکن اسے برداشت کرنے سے جو اخروی ثواب مجھے مل رہا ہے وہ تو جاتا رہے گا۔ یہ

جو ایذا میں برداشت کرتا ہوں اس کے نتیجے میں جو ترقی درجات مجھے ہوتی ہے یا جو اخروی ثواب مجھے ملتا ہے اس کا کیا ہو گا۔

یعنی اسلام نے مومن کی نگاہ کو وہ وسعت دی کہ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل میاں بیوی کے معاملات اولاد کے ساتھ تعلقات والدین کی خدمت یا دوست اور احباب کے ساتھ جو روابط ہیں ان سب میں بھی اس نے مومن کی نگاہ کو اس دن پر مرکوز کر دیا جب وہ اللہ کریم کے روبرو کھڑا ہو گا کہ ان اعمال کا نتیجہ کیا ہو گا اور یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جس عمل کا نتیجہ میدان حشر میں مثبت ہے اس پر دنیا میں کبھی نقصان مرتب نہیں ہوتا یہ بڑی عجیب بات ہے۔ آپ دیکھیں کہ جب تک مسلمانوں کی نگاہ میں یہ وسعت رہی تب تک روئے زمین کی حکومت و سلطنت بھی ان کے قدموں میں رہی دینوی فوائد بھی انہی کے پاس تھے۔ جب سے اپنی کم ہمتی کی وجہ سے اپنی کمزوری کے سبب سے اس تعلق میں اس رابطے میں کمی آئی اور وہ عملی کے بجائے زبانی ہی رہنا شروع ہو گیا تو یہ یقین بھی عمل کی حد سے نکل کر زبانی دعوؤں کی حد میں آ گیا اور ہماری عملی زندگی ایسی ہو گئی کہ ہم قیامت کو بھی مانتے ہیں اللہ کے ہاں جواب دہی کو بھی مانتے ہیں اور ایک ایک ٹکے کے لئے جرم بھی کرتے ہیں یہ کتنی بات ہے کہ ایک آدمی جانتا ہے مجھے اللہ کے روبرو حساب دینا ہے پھر وہ دو آنے دس آنے دس روپے پچاس روپے یا دس کروڑ کے لئے بھی بددیانتی کرتا ہے بددیانتی تو کرتا ہے زیادہ کے لئے کرتا ہے یا تھوڑے کے لئے بھی بد دیانتی تو کرتا ہے اسے پتہ ہے کہ میں جھوٹ بھول کر اللہ کے نظام کو تبدیل نہیں کر سکوں گا جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا میرا جھوٹ اسے بدلے گا نہیں لیکن وہ جھوٹ بولتا ہے کہ شاید اس طرح سے میں دنیا کی روش بدل دوں وہ سمجھتا ہے کہ دوسرے حق لے کر اگر میں کھاؤں گا۔

اگر کوئی قوم آپ کو خوشحال نظر آئے گی تو اس کی تجارت میں آپ کو دیانت داری نظر آئے گی۔

اب اخروی اجر کا تعلق تو ایمان سے ہے ایمان ہو گا تو اس کا اجر وہ آخرت میں بھی پائیں گے۔ تو ہماری یہ ضرورت ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے اپنی نسبت اپنے تعلق کو کمزور کر کے نہ دنیا میں باعزت طور پر باقی رہ سکتے ہیں اور نہ آخرت ہمارے ہاتھ آ سکتی ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہے ہمیں احسان نہیں کرنا کسی پر کسی دوسرے کے لئے نہیں کرنا بلکہ یہ ہماری ضرورت ہے اور اس کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں اور یہ سارے مجاہدے ساری محنت سارے ذکر اذکار جو ہیں ان کے جانچنے کا قاعدہ بھی یہی ہے کہ ہر ساتھی یہ دیکھا کرے کہ ذکر کرنے سے اللہ اللہ کرنے سے عبادت کرنے سے میں اس اخروی یقین کے کتنا قریب جا رہا ہوں اور یہ میری اعمال کو کس حد تک متاثر کر رہا ہے یہی سب سے بڑی ترقی سب سے بڑا درجہ سب سے بڑی ولایت یہی ہے نتیجہ اسی پر مرتب ہو گا اللہ کریم ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں ہماری لغزشوں سے درگزر فرمائیں اور ہماری یہ نعمت گم گشتہ پھر سے اس قدر عام کر دیں کہ ہر مسلمان کا سینہ اس نور سے منور ہو اور دنیا اسلام کا عروج پھر سے دیکھے۔(93-10-13)

دعائے مغفرت

سلسلہ عالیہ کے رفقاء

۱۔ نور زماں سرویئر (شیدو) نوشہرہ کی والدہ ماجدہ

۲۔ عبدالخالق ڈرائیور (بکھر بار) سرگودہا کے والد ماجد

۳۔ محمد اسلم ثاقب (اوکاڑہ) کی پھوپھی جان

۴۔ ڈاکٹر عبدالرشید (دارالعرفان) کی والدہ ماجدہ

۵۔ ماسٹر خاں محمد (بکھر بار) سرگودہا کے والد ماجد

قضائے الٰہی سے فوت ہو چکے ہیں ان سب کے لئے تمام ساتھیوں سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات واجتہادات

ڈاکٹر لیاقت علی خاں نیازی

اسلامی قانون کے ارتقائی کو مورخین تاریخ فقہ نے مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ سرعبدالرحیم نے اسے چار ادوار' ڈاکٹر صبحی نے پانچ ادوار' ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا نے ساتھ ادوار اور مصری عالم اور مورخ محمد خضری نے چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور علامہ محمد خضری کی نظر میں:

علامہ محمد الخضری نے تاریخ التشریع الاسلامی میں فقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ قرآن حکیم آپ کی ولادت کے اکتالیسویں سال سے آپ پر بتدریج نازل ہونا شروع ہوا یہاں تک کہ ۱۰ھ میں جب کہ آپ کی عمر کا تر یسٹھواں سال تھا ۹ ر ذی الحجہ سورہ مائدہ کی اکمال دین اور اتمام نعمت والی آیت نازل ہوئی۔ اسی بنا پر نزول قرآن کے ابتداء و انتہا کی کل مدت علامہ خضری کے الفاظ میں بائیس سال دو مہینے اور بائیس دن بنتی ہے۔ فقہ اسلام کا بنیادی ماخذ قرآن ہے۔ قرآن حکیم دراصل شریعت اسلامی میں دستور کی حیثیت رکھتا ہے اور قانون شرعی کا اصل سرچشمہ ہے۔ اس میں ہر حکم کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وضاحت فرمائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بطور حکم (جج) کے بھی فرائض سرانجام دیتے تھے اور مقدمات کا فیصلہ فرماتے تھے۔

قرآن مجید بطور ماخذ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیات احکام یعنی فقہی آیتیں اکثر ان واقعات کے جواب میں نازل ہوتی تھیں جو اسلامی معاشرہ میں پیدا ہو جایا کرتے تھے۔ نزول قرآن کے دو دور ہیں۔

۱) قبل از ہجرت (۶۲۲ سے قبل)۔

۲) ہجرت کے بعد (۶۲۲ سے ۶۳۲ تک)۔

آیات مکی بھی ہیں اور مدنی بھی۔ مکی آیات میں وحدانیت' قیامت اور اخلاق کی باتیں ہیں جب کہ فقہی مسائل اور احکام کی تفصیل زیادہ تر مدنی آیتوں میں دی گئی ہے۔

قرآن مجید انسانی حالات کی اصلاح کے لئے نازل کیا گیا۔ قرآن حکیم نے فقہی احکام میں تین چیزوں کو اپنا بنیادی اصول قرار دیا یعنی عدم حرج' قلت تکلیف اور تدریج۔ حدیث شریف میں آیا ہے "میں سہل اور سیدھے مذہب کو لے کر مبعوث ہوا ہوں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قبل عرب معاشرے کی حالت بگڑی ہوئی تھی اور جنگلی قانون کا دور دورہ تھا۔ آپ نے قرآن حکیم کی روشنی میں بتدریج جرائم (مثلاً"

شراب اور جوئے) سے مکمل طور پر منع فرما دیا۔ جملہ احکام قرآنیہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱) عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج)۔

۲) بندوں کے باہمی معاملات، قوانین تحفظ، دعوت اسلام یعنی جہاد، قوانین استقلال خاندان یعنی وہ احکام جو نکاح، طلاق، نسب اور وارثت سے متعلق ہیں۔ قوانین معاملات یعنی بیع اور اجارہ وغیرہ۔

۳) قوانین تعزیری یعنی حدود و قصاص

حدیث کا مقام:

حدیث سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال و افعال ہیں اور دوسروں کے وہ اعمال جن کو آپ نے قائم و برقرار رکھا۔ آپ شارح کلام الٰہی ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

"اے رسول جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دے۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

"اور ہم نے تیری طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تا کہ تو لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دے جو ان کے لئے نازل کیا گیا ہے اور تا کہ وہ اس میں غور و فکر کریں۔"

آپ نے قرآن مجید کے مطالب کو قول و فعل سے بیان اور ادا فرمایا۔ آپ نے نماز ادا فرمائی اور فرمایا "نماز ادا کرو جس طرح مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو"

آپ مشکل آیتوں کی تفسیر کرتے ہیں۔ قران حکیم نے آپ کی پیروی کو واجب قرار دیا۔ آپ نے احادیث میں نماز اور زکوٰۃ کی تشریح فرمائی۔ آپ ان چیزوں میں جو دو کھلی ہوئی چیزوں کے درمیان واقع ہیں اجتہاداً فرماتے تھے اور چیزیں جو اصول و فروع کے درمیان دائر ہیں ان میں قیاس کرتے تھے۔ قرآن میں حلال و حرام چیزوں کا ذکر ہوا۔ آپ نے اجتہاد ان کی توضیح کی۔

اجتہادات نبویؐ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر درندہ جانور کو حرام قرار دیا اور پالتوں گدھوں کے گوشت کی ممانعت فرمائی۔ خدا نے پینے کی غیر منشی چیزوں کو حلال کیا اور منشی چیزوں کو حرام قرار دیا۔ آپ نے ہر منشی چیز حرام قرار دی۔ فرمایا

"وکل مسکر حرام"

احرام حج میں شکار کی ممانعت ہے۔ حدیث میں وجوب کفارہ کے متعلق قصدو خطا دونوں کو برابر کر دیا گیا۔ قرآن میں سود حرام ہے۔ آپ نے احادیث میں مختلف الاجناس چیزوں کی خرید و فروخت کو بھی سود قرار دیا۔ خدا نے ماں بیٹی اور دو بہنوں کے نکاح کو حرام کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ سے ایک ساتھ نکاح کرنے کی ممانعت فرمائی۔ اجتہادات کی دیگر مثالیں درج ذیل ہیں۔

احکام دیت۔ احکام دیت کا مختصراً ذکر قرآن حکیم میں درج ہے۔ احادیث سے ان احکام کو واضح کیا گیا ہے۔ دیگر ائمہ کرام نے بھی اس ضمن میں وضاحت فرمائی جیسے امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب الام۔

عبادات۔ اکثر عملی احادیث میں زکوٰۃ، نماز اور حج کے احکام کی تشریح فرمائی اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ سے یہ تعلیمات بالمشافہ اخذ کیں۔ حدیث نے عملاً اور چند نمازیں بتلائیں جو نفل ہیں مثلاً عیدین کی نماز۔ رمضان کے علاوہ سال میں اور جو روزے رکھے جاتے ہیں ان کو آپؐ نے مسنون قرار دیا۔ حج اور عمرہ میں تعلیمات کی توضیح فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ "مجھ سے اپنے ارکان سیکھو" نظام زکوٰۃ کی تشریح فرمائی۔

دیگر معاملات۔ جہاد کا ذکر سورہ نساء، سورہ انفال اور سورہ حج و دیگر مقامات پر درج ہے آپ نے جنگی اصولوں کی تشریح فرمائی۔ معاہدات باہمی کی توضیح فرمائی، اسیران جنگ کا ذکر سورہ قتال میں ہے۔ آپ نے چند مخصوص

اسباب کی بناء پر بعض قیدیوں کے قتل کا حکم دیا مثلاً" بدر میں عقبہ کے قتل کا حکم (جو مخالفین کی مدد کرتا تھا۔) آپ نے غزوات (مثلاً" بدر' احد وغیرہ) میں اپنے قول و فعل سے احکام سے قرآنی کی تشریح فرمائی۔

نظام منزلی۔ قرآن حکیم میں نظام منزلی (نکاح' رضاعت' طلاق وغیرہ) کا ذکر ہے۔ آپ نے حدیث میں بھی نکاح اور اضافہ تعداد امت کی خاص طور پر سخت ترغیب دی۔ رضاعت کی بناء پر نکاح حرام ہونا قرآن سے ثابت ہے آپؐ نے اس کی تشریح فرمائی۔ قرآن حکیم حقوق میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا قائل ہے تاہم گھر کا سربراہ مرد ہی ہے۔ احادیث میں مردوں کو حسن معاشرت کا بہ کثرت حکم دیا گیا ہے۔ طلاق کے بارے میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو قرآن کی خلاف ورزی کی تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا اور حکم دیا کہ عدت کے پورے زمانے میں عورت سسرال قیام کرے۔ استیذان کے بارے میں سورۃ نور میں احکام موجود ہیں۔ آپ نے اس کی تفصیل اور احکام جاری فرمائے۔ آداب حجاب کی تفصیل بیان فرمائی۔

نظام وارثت و معاملات۔ آپ نے نظام وارثت اور معاملات میں احکام قرآنی کی تشریح بیان فرمائی۔

تعزیرات۔ قرآن میں پانچ سزائیں قصاص' حد زنا' حدقذف' حد سرقہ اور ڈاکہ کی سزا موجود ہے۔ آپ نے حدیث میں چھٹی سزا شراب نوش کر دی۔ آپؐ نے نظام دیت کی توضیح کی اور بعض دیتوں کا ذمہ دار عاقلہ یعنی اہل قبیلہ یا اہل محلّہ کو قرار دیا۔ سورہ نور میں ارشاد ہے زانی اور زانیہ کی سزا کو سو کوڑے ہے۔ حدیث میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا رجم یعنی سنگسار مقرر فرمائی (صحیح مسلم ملاحظہ فرمائیں۔) حدیث میں مندرجہ ذیل بالا سزاؤں کو نافذ کرنے میں حاکم کو احتیاط کا حکم دیا گیا۔ بقول علامہ خضری "یہ وہ احکام ہیں جو خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل فرمائے تھے اور آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ لوگوں تک ان کو پہنچا دیں اور ان کی تشریح فرما دی۔"

حضرت عائشہ فرماتی ہیں "آپ کا خلق قرآن تھا"

آپ نے حجتہ الوداع میں نسل انسانی کے حقوق کا منشور پہلی دفعہ اقوام عالم کو دیا جو بقول رابرٹ بریفو بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بقول بیسونی یہ سب کچھ اجتہاد نبویہ کی وجہ سے تھا۔ الغرض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور میں فقہ و اجتہاد کی بنیاد رکھی اور دوسروں کی اس پر حوصلہ افزائی اور بعض مواقع پر زبانی توثیق و تائید سے اس کی ضرورت اور اہمیت سمجھائی۔ آج بھی فقہ اسلامی کے نفاذ کی پاکستان میں اشد ضرورت ہے۔ اجتہاد وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

مسلمان سکالرز اور ماہرین کے لئے دعوت

زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ خصوصاً تعلیم و تدریس (ہر شعبہ) میڈیکل سائنسز' ٹیکنیکل و ٹیکنالوجی' صنعت' بنکنگ و فنانس' قانون و عدلیہ اور بے شمار دوسرے شعبوں کے ماہرین سے گذارش ہے کہ ریسرچ اور تحقیق کے مختلف کاموں میں ہمیں آپ کی ماہرانہ رائے' تجربات اور مقالوں کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ اس کے لئے مناسب ہو گا کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوں۔ آپ اپنے نام اور پتے کے علاوہ اپنا Personal Data ہمیں بھیج دیں تو ہم آپ سے وقتاً" فوقتاً" رابطہ قائم رکھیں گے۔ آپ کا Personal Data ہمارے پاس مکمل Confidential رہے گا۔

تاج رحیم
سیکرٹری نشر و اشاعت و تحقیق
اویسیہ سوسائٹی' کالج روڈ' ٹاؤن شپ لاہور

آپ نے پوچھا

سوال : شریعت اور طریقت میں کیا فرق ہے؟

جواب : شریعت اور طریقت میں فرق یہ ہے کہ شریعت تھیوری کو کہتے ہیں' طریقت اس پر عمل کرنے کا نام ہے۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی عمل تو کرتا ہے لیکن وہ محض خانہ پری کرتا ہے' اس میں خلوص نہیں ہوتا اس میں گہرائی نہیں ہوتی۔ مثلاً" جیسے لوگ ساٹھ ساٹھ برس تک نماز ادا کرتے رہتے ہیں لیکن ساٹھ برسوں میں یہ کوشش نہیں کرتے کہ الفاظ درست کر لیں یا ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھتے ہیں اسی اسی برس عمر ہو گئی کسی نے فکر نہیں کی کہ سورہ فاتحہ کا ترجمہ کیا ہے؟ نماز میں کیا پڑھتا رہا؟ ایک روٹین ہے باپ دادا سے ملی۔ اس روٹین میں ہم عمل کر رہے ہیں۔ فرصت ملی ادا کر لی نہ ملی نہ سہی۔ نماز ادا کر رہے ہیں خیال کہیں بھٹک رہا ہے دل کہیں اور ہے۔ کبھی اپنے پر جبر کر کے پڑھ لی کبھی نہ ادا کی۔ اس صورت حال سے نکل کر یہ کوشش کرنا کہ شریعت پر خلوص سے عمل کروں' شریعت کو سمجھنے کا احساس پیدا ہو۔ اس کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے اسے طریقت کہتے ہیں۔

سوال : آج کل نقلی اعضاء لگائے جاتے ہیں کیا یہ صنعت باری میں مداخلت ہے؟

جواب : اصل بات یہ ہے کہ جہاں تک انسانی صنعت کا تعلق ہے اس کی بنیاد صرف اس بات پر ہے کہ اسے آپ بیالوجی کہیں یا سائنس کا کوئی دوسرا شعبہ کہیں کہ جو چیزیں قدرتی تخلیق پاتی ہیں ان کے عالم اسباب میں تخلیق پانے کے اسباب کیا ہیں؟ اور ان میں کس چیز کی ریشو کتنی ہوتی ہے؟ بندہ تخلیق کچھ نہیں کرتا۔ تخلیق ہر حال میں اللہ ہی کرتا ہے۔ اس کے پیدا کئے ہوئے کچھ عناصر کو ایک خاص ریشو سے اگر جمع کیا جائے تو ایک نئی چیز بن جاتی ہے۔ جیسے آپ مختلف کھانے بناتے ہیں' ایک خاص نسبت کا میٹھا ڈالتے ہیں' گھی ڈالتے ہیں میدہ ڈالتے ہیں' مختلف چیزیں ڈالتے ہیں تو ایک طرح کی مٹھائی بن جاتی ہے۔ اس کی مختلف ریشو کرتے ہیں تو دوسری طرح کی مٹھائی بن جاتی ہے۔ آپ گوشت پکاتے ہیں اس میں ایک ریشو رکھتے ہیں مصالحے کی تو ایک طرح کی ہانڈی بن جاتی ہے' دوسرے ریشو رکھتے ہیں تو اسی گوشت کا دوسری طرح کا پکوان بن جاتا ہے۔ اسی طرح سے عالم تخلیق میں کچھ چیزیں جو وجود پذیر ہوتی ہیں مثلاً" یہ درخت ہے اب آپ درخت تو لگاتے ہیں کٹھی کا' اوپر اس پہ مالٹا پیوند کر دیتے ہیں تو وہ جڑ یا تنا نیچے سے کٹھی کا آ رہا ہوتا ہے اور اوپر وہ مالٹے کے پھل دے رہا ہے۔ اسی طرح مختلف درختوں کو یا دو تین درختوں کو ملا کر ایک نئی قسم کا پھل بن جاتا ہے۔ نیا درخت بن جاتا ہے تو یہ صنعت باری میں مداخلت نہیں ہے بلکہ صنعت باری کے اصولوں کو سمجھ کر اپنی سہولت کے لئے کچھ نئی چیزیں بنانا ہے۔ ان ساری

چیزوں کی بنیاد قرآن حکیم اور ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ دور حاضرہ کی ایجادات کے شروع کرنے والے مسلمان ہیں اور جب مسلمان ایجادات کر رہے تھے تب کلیسا اور مغرب والے اسے جادو اور اس کے ماننے والوں کو جادوگر کہہ کر ان پر مقدمے چلاتے تھے اور انہیں زندہ جلایا جاتا تھا۔ اور لاکھوں مردوں عورتوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ بعض کو گردن تک زمین میں دفن کر کے چھوڑ دیتے تھے وہ تڑپ تڑپ کر مرتے رہتے تھے۔ اسی طرح کی سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ کہ یہ ان کی بات پہ نہ جائیں۔ اس سے مذہب کو خطرہ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نبی علیہ والصلوۃ و السلام نے مسلمانوں کو علم کی اہمیت کا احساس دلایا تھا صرف دین کو علم نہیں کہا جاتا۔ علم دین تو خیر اساس ہے لیکن نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق العلم علمان جسے آپ مکمل علم کہیں گے اس کے دو شعبے ہیں العلم علمان۔ ۱ علم الادیان ۲ علم الابدان علم الادیان دین کا علم، یا نارمیٹو سائنسز کا علم اخلاقیات کا علم، اصولوں کا علم، انسانیت کا علم، انسانی کردار کا علم ہے۔ اور فزیکل سائنس کا علم، علم الابدان ہے۔ نبی علیہ السلام کے حکم کے مطابق یہ دونوں علوم مل کر العلم بنتا ہے۔ جسے ہم مکمل علم کہیں گے۔ مسلمانوں نے دینوی علوم حاصل کئے۔ پہیے سے لے کر بارود تک اور بحری بیڑے سے لے کر حکومتی اصولوں تک یہ سب چیزیں مسلمانوں نے ایجاد کیں۔ بلکہ بہت بعد کے زمانے میں جب خلافت بغداد میں تھی تو خلیفہ بغداد نے کسی یورپی حکمران کو ایک گھڑی بھیجی تھی تو یورپ کے دربار سے وفد آیا تھا کہ اس سے وقت کا پتہ کیسے چلایا جاتا ہے؟ یہ بتانے کے لئے بھی کوئی بندہ بھیجیں۔ اتنا فاصلہ تھا مسلمانوں میں اور یورپ میں۔ مرور زمانہ سے مسلمان جب دین سے دور ہوتے گئے تو وہ کمالات چھنتے گئے اور کافروں نے اس بات پہ تحقیق کی کہ ایک خانہ بدوش قوم صحرا سے اٹھ کر کس طرح دنیا پر چھا گئے؟ اس کا سبب کیا ہے؟ بڑی بڑی قومیں موجود تھیں، بڑی بڑی سلطنتیں موجود تھیں اور عرب کے شمار قطار میں نہیں تھے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ یہ جو سکون سے ایک گاؤں میں نہیں رہ سکتے تھے، ایک گھر نہیں بسا سکتے تھے، ہر ایک کا الگ الگ تمبو کندھے پر ہوتا اور لڑائی بھڑائی میں مصروف رہتے تو یہ اتنی کامل اور اتنی جامع قوم کیسے بن گئی کہ انہوں نے پوری دنیا کو فتح کر کے آگے لگا لیا؟ وہ ریزن (وجہ) انہوں نے تلاش کی۔ ایمان اگرچہ نہ لائے لیکن دینوی اعتبار سے وہ اسباب انہوں نے تلاش کئے۔ اس میں علم تھا، ضبط تھا، نظم تھا، دیانت داری تھی، لین دین میں خلوص تھا، تعلیم کو عام کرنے کی بات تھی۔ وہ چیزیں انہوں نے ایڈاپٹ کرنا شروع کر دیں ہم نے چھوڑنا شروع کر دیں۔ ہمیں بنی بنائی ہوئی سلطنتیں ملیں فتح کی ہوئی دنیا ملی تو ہم نے وہ چھوڑنا شروع کر دیں۔ اب یہی عرب تھے جو سارا سارا دن گھوڑے کی پیٹھ پہ اور ساری ساری رات جانماز پر گزار دیتے تھے۔ اب وہ بغیر ائیر کنڈیشن کے مورچے میں نہیں بیٹھتے۔ ہم اب روبہ زوال ہو گئے اور اہل یورپ نے ہماری اچھی چیزیں اختیار کر لیں۔

ایک دن سرگودھا کے سیشن جج میرے ساتھ تھے۔ آج کل شاید وہ چکوال میں ہیں تو وہ مجھے بتانے لگے کہ ہم برطانیہ میں پڑھتے تھے۔ جب ہم وہاں کے کالج سے فارغ ہوئے تو پرنسپل سے ملنے گئے۔ باتوں باتوں میں وہ پرنسپل کہنے لگا کہ یہ جو برطانیہ ہے یہ ویلفیئر سٹیٹ ہے۔ جانتے ہو یہ ویلفیئر سٹیٹ کیسے بنی ہم نے کہا جی آپ جانتے ہیں، ہمیں کیا پتہ۔ اس نے کہا یہ سارا خاکہ کنگ کو میں نے دیا تھا (وہ کنگ ایڈورڈ ہفتم کے زمانے کا بندہ تھا) اور میں نے یہ قرآن سے لیا کہ ریاست کی ذمہ داری کیا ہے؟ اور کس طرح سے اسے اپنے لوگوں کا غریبوں کا بے روزگاروں کا، بیماروں کا خیال رکھنا چاہئے؟ کس طرح کا ٹیکس امراء لے اور کس طرح سے ان کی Look After (دیکھ بھال) کرے۔ تب سے اب تک برطانیہ اس کے مطابق ویلفیئر سٹیٹ ہے۔

یعنی مغرب نے وہ چیزیں ہم سے لیں۔ ہمیں قرآن نے اس وقت بتایا تھا و خلق لکم مافی الارض

جمیعا۔ جو کچھ زمین میں صورت پذیر ہوتا ہے یہ سب کچھ تمہارے لئے ہے۔ و سخر لکم الشمس و القمر۔ تمہارے لئے انرجی (طاقت) اور لائیٹ (روشنی) کو ہم نے تمہارے تابع کر دیا۔ اب یہ سارا کھیل انرجی (طاقت) پاور (قوت) کا اور لائیٹ (روشنی) کا ہے۔ تو یہ اثاثہ ہمارا تھا اب نوبت اس جا پہ آ گئی کہ وہ تخلیق کرتے ہیں اور ہم کلیسا والوں کی طرح فتوے لگاتے ہیں۔ کبھی ہم ایجادات کرتے تھے' اور وہ فتوے لگاتے تھے اب وہ ایجادات کرتے ہیں اور ہم یہاں بیٹھ کر فتوے لگاتے ہیں۔ صنعت باری میں بندہ مداخلت کر سکتا ہی نہیں ممکن ہی نہیں میاں محمد صاحب نے کہا تھا پنجابی میں ۔

کہ جے ہک مچھر دا پر بھجے تے سارای عالم لگے فیر نہیں اوہ ثابت ہوندا جو کہ آ ہا آگے

مچھر کے جسم سے یا مچھر کے انڈے سے جس طرح کا پر بن کے نکلتا ہے دنیا کی کوئی مشین ویسا پر نہیں بنا سکتی۔ گھاس کا ایک تنکا اگانے کے لئے مٹی ہی چاہئے۔ آپ اسے مصنوعی طور پہ مطلوبہ موسم دے سکتے ہیں اس میں مطلوبہ نمی پہنچا سکتے ہیں' وہ اصول آپ جان سکتے ہیں لیکن وہ سب کچھ آپ مٹی کو دیں گے۔ گھاس مٹی ہی سے پیدا ہو گی' مشین گھاس نہیں بنائے گی۔

کئی سال پہلے کی بات ہے برما شاید ہانگ کانگ میں برطانوی گھوڑوں کی ریس (دوڑ) تھی برما ان کے گھوڑے وہاں جا کر ہار گئے تو انہوں نے آ کر وجہ تلاش کی کہ ہمارے گھوڑے کیوں نہیں دوڑ سکے آخر وہ اس بات پہ متفق ہوئے کہ یہاں برطانیہ میں گھوڑوں کو سارا سال سبز چارہ ملتا ہے وہاں جا کر انہیں سبز چارہ مہیا نہیں تھا اور وہ خشک راشن ساتھ لے گئے تھے۔ اس لئے یہ ہار گئے۔ انہوں نے کہا " اگلے سال پھر ریس میں حصہ لیں گے اور انہیں سبز چارہ دیں گے" مگر سبز چارہ کیسے دیں گے؟ اگر یہاں سے باندھ کر لے جاتے ہیں تو گھاس جو برطانیہ میں ہوتی ہے وہاں جانے تک سوکھ گئی۔ جو برطانیہ میں ہوتی ہے وہ برما اور ہانگ کانگ میں ہوتی نہیں۔ یہ گھوڑے جس چارے کے عادی ہیں وہ وہاں نہیں ملتا۔ They Created the machine انہوں نے ایک نئی مشین بنائی۔ جس میں وہ مٹی ڈال کے مٹی میں گھاس کا بیج ڈال دیتے اور وہ اس گھاس کو اتنی نمی اور اتنی گرمائش دیتی کہ چند گھنٹوں میں وہ گھاس مشین سے فٹ فٹ ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ لمبا ہو کر نکلتا۔ تو انہوں نے اپنے گھوڑوں کو وہاں سبز چارہ مہیا کیا۔ لیکن گھاس معروف طریقے سے مٹی سے ہی پیدا ہوتی تھی' مشین نہیں بنا سکتی تھی۔ مشین اسے مطلوبہ نمی مطلوبہ ہیٹ (گرمی) مہیا کر سکتی تھی یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کوئی میٹریل کسی مشین میں ڈالیں اور گھاس کی تاریں بن کر نکلنا شروع ہو جائیں اور گھوڑے کھالیں یہ ممکن نہیں۔ صنعت باری میں بندہ مداخلت کر ہی نہیں سکتا۔

اب یہ الگ بات ہے کہ اس کی صنعت کے جو طریقے ہیں انہیں جان کر کچھ چیزوں کو ملاتا ہے تو ایک نئی طرح کی چیز وجود میں آجاتی ہے۔ تو دراصل وہ صانع اللہ ہی ہوتا ہے۔ اسی کے بنائے ہوئے وہ اصول ہیں۔ اور اگر ان اصولوں میں وہ تاثیر نہ پیدا کرنا چاہے تو بھی قادر ہے۔ کتنے تجربے ان کے فیل ہو جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں بھی دنیوی علوم کے اس درجے تک پہنچنا چاہئے کہ ہم ان سے ایجادات میں پھر سبقت لے جائیں۔ اب کوئی بھی ایجاد آتی ہے تو فتویٰ لگانے سے رک تو نہیں جائے گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ فتویٰ غیر مسلم پہ تو موثر ہی نہیں ہے۔ اسے کیا فکر ہے کہ مولانا نے فتویٰ دیا ہے۔ وہ ایجاد تو اپنا کام کر رہی ہے مثلاً" ٹی وی پہ فتویٰ لگا ہوا ہے تو اس سے ٹی وی ٹوٹ جائے گا کیا؟ یا سٹیلائیٹ گر جائے گا؟ کچھ نہیں ہو گا۔ کافر اس سے جو فحاشی' جو بے حیائی یا جو برائی پھیلانا چاہتا ہے وہ اپنا کام کر رہا ہے۔ ہم اگر فتویٰ لگانے کی بجائے اسے ایڈایٹ (اختیار) کرتے اور اس کے مقابلے میں اتنی نیکی پھیلانے کے لئے اسے استعمال کرتے تو یہ بہتر طریقہ تھا۔ کیونکہ فتوے سے وہ رکا تو نہیں وہ تو اپنا کام کر رہا ہے۔

اگلے دن میں امریکہ سے آیا ہوا ایک اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس میں جو امریکن قادیانی ہیں ان کے بارے میں لکھا تھا کہ پاکستان میں ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔ یہاں (امریکہ میں) یہ سیٹل ہو گئے امریکہ انہیں کافی سپورٹ (Support) کر رہا ہے۔ کچھ تصویریں ان کی دکھائیں جس میں وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے بڑی مسجد بنائی ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں ان کا انٹرویو تھا انہوں نے اپنا ایک ٹی وی چینل خریدا ہے تو اس انٹرویو کے ایک جملے نے مجھے بڑا سٹرائیک کیا۔ اس نے کہا۔

Now we are in every Bed room of Everyhouse.

"کسی کو بات پسند آئے یا نہ آئے لیکن اس کے انتہائی خلوت کدے میں ہم موجود ہیں۔" چونکہ وہاں ٹی وی تو پڑا ہے۔ ہماری بات تو وہاں پہنچے گی۔ تو اگر اس انداز سے اس ایجاد کو ہم بھی لیتے۔ بجائے فحاشی کے' اس پر فحاشی کے خلاف بات کرتے۔ انسانی اقدار کی بات کرتے' اسلامی نظریات کی بات کرتے' اسلامی عقائد کی بات کرتے تو اس کا رد ہوتا۔ اس کا جواب ہوتا یا اپنا قومی ٹیلی ویژن نیٹ ورک جو ہے یہ میرے خیال میں اٹھارہ گھنٹے کام کرتا ہے کہ اس پہ اٹھارہ میں سے آٹھ گھنٹے یا چار گھنٹے تو دین کو دے دو۔ اس میں تو کچھ منٹ ہوتے ہیں۔ روزانہ بسم اللہ کر کے شروع کرتے ہیں اور جو دنیا کی فواحشات ہیں' بکتے ہیں اور ختم کرتے ہیں درس قرآن پر پانچ منٹ کا وہ قرآنی تعلیمات کا پروگرام ہوتا ہے۔ آخر میں رات کو ایک بجے' دو بجے' بارہ بجے بسم اللہ سے شروع کر کے وہ جب بند کرنا چاہیں تو اس پہ کوئی پانچ منٹ یا چار منٹ کا قرآنی تعلیمات کا پروگرام ہوتا ہے درمیان میں سارا بکواس یا ہفتے میں ایک آدھ بیس پچیس منٹ کا پروگرام ہو جاتا ہے۔ تو فتویٰ لگانے کی بجائے اگر یہ قوم با شعور ہوتی اور یہ مطالبہ کرتی کہ اس پہ دین کی بات کی جائے' بچوں کی تعلیم کی بات کی جائے' اسلامی اخلاق کی بات کی جائے یا آپ کو ڈرامے ہی دکھانے ہیں تو مسلمانوں کی تاریخ بھری پڑی ہے' اسلام کی ہسٹری (تاریخ) دکھاؤ' ہمیں مسلمانوں کے کارنامے دکھاؤ' آخر انسان تھے وہ بھی کس طرح روئے زمین پر پھیلے کس طرح سے انہوں نے مقابلے کئے؟ اتنی بڑی بڑی سلطنتوں کے تختے کس طرح سے الٹ دئے؟ کیسے ممکن تھا؟ تو وہ بہتر ہوتا میں تو اس حق میں نہیں ہوں کہ فتوے لگائے جائیں میں تو اس حق میں ہوں کہ ہمیں بھی وہ علوم حاصل کرنے چاہیں اور ان سے زیادہ بہتر طریقے سے کرنے چاہیں۔

ایک بات میں آپ کو اور بتا دوں جتنی ایجادات مغرب میں ہو رہی ہیں آج بھی ان میں بیسک (بنیادی) کام کرنے والے مسلمان ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نام مغرب کا ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ وہاں جا کر کرتے ہیں لیکن کسی بھی اعلیٰ اسپیچ چیوشن (ادارے) میں جا کر دیکھ لو۔ وہاں بنیادی طور پر جو ریسرچ سکالر ہوں گے یا کام کرنے والے جو ہوں گے وہ مسلمان ہوں گے۔ ٹیلنٹ ہمارا ہے نام مغرب کا ہو رہا ہے۔ کوئی چوٹی کا ڈاکٹر ہو گا کوئی پائے کا سائنٹسٹ ہو گا۔ میں نے ہر جگہ پھر کے دیکھا ہے جہاں جاؤ مسلمان ہیں۔ یہ آپ کی جو فیکس مشین ہے یہ ایک پاکستانی نے ایجاد کی تھی۔ پھیلائی امریکن نے کتنی عجیب مشین ہے۔ اس کا موجد ایک پاکستانی ہے۔ آرمی کا ریٹائرڈ میجر تھا۔ اس نے پہلے پاکستان گورنمنٹ کو بنا کر دی۔ یہاں اسے کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔ وہ وہاں چلا گیا انہوں نے ایڈاپٹ کر لی۔ پھر اسے ماڈی فائی کرتے کرتے اب کہاں چلی گئی؟ اس طرح کی بے شمار ایجادات آج بھی ایسی ہیں جو بنیادی طور پر مسلمانوں نے کی ہیں لیکن نام مغرب کا ہو گیا' چونکہ وہاں جا کر کی ہیں یہاں انہیں کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔ تو یہ بات فتوؤں سے نہیں ہو گی یہ بات تو مقابلہ کرنے کی ہے۔ صنعت باری میں کوئی مداخلت کرنا انسان کے بس کی بات ہی نہیں' کر ہی نہیں سکتا کسی بھی پہلو سے نہیں کر سکتا۔

سوال : تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت کیسا ہے؟

جواب : تبلیغی جماعت کی بنیاد رکھی تھی مولانا محمد الیاس رحمتہ

اللہ تعالے علیہ نے اسکی ایک خاص وجہ تھی۔ دہلی کے نواح میں کچھ علاقے ایسے تھے (آپ نے دیکھا ہو گا لوگ وہاں سے ہجرت کر کے آئے' یہاں بھی آئے) وہ ڈاٹھا سکھوں کی طرح باندھتے تھے اور ختنے تک نہیں کئے ہوئے تھے۔ نماز کسی کو نہیں آتی تھی' کلمہ تک نہیں جانتے تھے۔ وہ بیچارے نام کے مسلمان تھے اکثریت وہاں سکھوں کی یا ہندوؤں کی تھی اور وہ لینڈ لارڈ بڑے زمیندار تھے۔ یہ مزارع تھے' کمزور لوگ تھے' دب گئے۔ تو مولانا مرحوم نے یہ جماعت شروع کی کہ اس علاقے میں لوگوں کو باری باری بھیجتے تھے کہ کچھ بنیادی عقائد' بنیادی کلمہ' نماز یا کچھ ارکان دین' اسلام کی بنیادی باتیں انہیں سکھا دی جائیں۔ اور یہ بہت بڑی عمدہ کوشش تھی۔ پھر حالات بدلتے گئے۔ پھر دنیا بدل گئی' زمانہ بدلا' ملک بدل گئے۔ کام اچھا تھا' پھیلتا رہا کرنے والوں یا بنیاد رکھنے والوں کا خلوص تھا تو اللہ نے قبول فرمایا اور وہ دنیا میں عالمی سٹیج پہ چلا گیا۔ لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ جب اس صورت حال سے نکل کر باہر پھیلا تو اس کا دائرہ کار بھی بڑھایا جاتا۔ یعنی جہاں بیسکس (بنیادی) ضرورتیں تھیں وہاں تو وہ کام کر رہا تھا وہ تو ٹھیک تھا جب وہاں سے بڑھا اور ان لوگوں میں پہنچا جن میں عالم بھی تھے' پڑھے لکھے لوگ بھی تھے تو اس کے دائرہ کار کو آگے بڑھا دیا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا' زیادہ نفع بخش ہوتا۔ لیکن ہماری بد قسمتی کہ اسے انہی بنیادی پانچ چھ باتوں پہ روک دیا گیا۔ اب اس کا ایک فائدہ ضرور ہے کہ دیہات میں یا دور دراز علاقوں میں جہاں لوگ کلمہ بھی نہیں جانتے وہاں کم از کم کچھ کام بیسکس کا تو ہو رہا ہے لیکن اگر اس کا دائرہ کار بڑھا دیا جاتا اور اس میں وسعت آجاتی تو بہت زیادہ کام ہوتا۔ اب چونکہ وہ بیسکس سے آگے نہیں بڑھتے اس لئے ان سوالوں کا جواب یا ان باتوں کا کوئی رد ان کے پاس ہے نہیں۔ وہ تو وہی پہلی چار پانچ باتیں کرتے ہیں۔ ایک لحاظ سے بہتر ہے کہ جہاں کوئی بھی بتانے والا نہیں وہاں جا کر کچھ تو سکھا آتے ہیں۔ اس میں کمزوری صرف ایک آگئی ہے کہ یہ جو احساس پیدا ہو گیا ہے کہ صرف یہی کافی ہے' یہ صحیح نہیں ہے۔ یعنی یہ کہنا کہ یہ بھی ضروری ہے یہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے کہے دنیا صرف یہی ضروری ہے اس سے آگے کچھ نہیں تو یہ درست نہیں اس میں خامی آگئی۔ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ ابھی میں عرض کر رہا تھا کہ لوگوں کی عمریں گزر گئیں' بیچاروں کو سورۃ فاتحہ کا ترجمہ نہیں آتا' کوئی انہیں کلمے کی اصلاح کر دے یا بنیادی نظریات بتا دے تو بہت اچھی بات ہے مگر اس پہ رک جانا یا صرف یہ کہہ دینا کہ اب یہی کافی ہے' یہ درست نہیں ہے۔ یہ تو بیسکس صرف بنیاد ہے نا آگے بھی تو پوری زندگی یا پورا فیلڈ پڑا ہے۔ وہ بھی زیر بحث لانا چاہئے۔ اللہ کرے کبھی ایسی مثبت تبدیلی بھی آجائے گی۔ بہت بڑا کام ہو رہا ہے اس میں اور زیادہ ترقی پا جائے۔

سوال : مختلف دینی جماعتوں کا اصرار ہے کہ صرف وہ ٹھیک کام کر رہے ہیں؟

جواب : ہمارے یہاں ایک نقص ہے کے مثلاً" آرمی میں سارے لوگ ایک کام تو نہیں کرتے' ہر شعبے کا ایک الگ محکمہ ہے ٹرانسپورٹ کا الگ ہے' فائٹنگ فورس الگ ہے' ہسپتال کا الگ ہے' کمیونی کیشن سسٹم الگ ہے۔ پورے پورے محکمے الگ ہیں ۔ یہ سگنل ہے' یہ گنرز ہیں' یہ سولجرز ہیں' یہ پیدل فوج ہے' یہ آرمڈ ڈویژن ہے۔ اب وہ سارے آپس میں نہیں لڑتے۔ سارے مل کے لڑتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سب فوج ہیں۔ ہمارے ہاں جو دینی کام ہو رہا ہے اس میں یہ کمزوری آگئی ہے کہ جو بندہ ایک کام کر رہا ہے وہ کہتا ہے یہی صحیح ہے دوسرا جو ہے یہ چور ہے' اسے نہیں ہونا چاہئے۔ وہ جو کوارڈی نیشن (یا رابطہ آپ جیسے کہیں) دینی شعبوں میں وہ نہیں رہا۔ اب میرے ساتھ بات ہو گی تو میں تبلیغی جماعت پہ تنقید ہی کروں گا۔ یہ نہیں کروں گا کہ جو انہوں نے کیا ہے اس سے اگلا میں کر لوں۔ ان کے ساتھ بات ہو گی تو وہ ہم پہ تنقید ہی کریں گے یہ نہیں سوچیں گے کہ جو یہ کر رہے ہیں ہم وہ کر لیں۔ یعنی دینی جماعتوں میں ایک رابطہ ہو تو پھر تو یہ بہت بڑی طاقت ہے۔

چونکہ یہ سارے، کام تو دین ہی کا کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی ایک سیاسی پہلو پہ کام کر رہی ہے، دینی مدارس جو ہیں وہ پڑھانے کا کام کر رہے ہیں۔ اور تبلیغی جماعت والے تبلیغ کا کر رہے ہیں۔ اب اس میں ایک رابطہ بن جائے، کوئی ایسا سبب ہو تو پھر تو ایک منظم طاقت بن جائے۔ مصیبت یہ ہے نا کہ رابطہ ہے نہیں۔ اب آپ کی فوج میں جو ہسپتال والے ہیں وہ جان بچانے والے لوگ ہیں لیکن اگر آپ کہیں جی ہسپتال والوں نے فلاں مورچہ کیوں نہیں فتح کیا؟ تو ان کا شعبہ نہیں ہے۔ وہ زخمیوں کی دیکھ بھال تو کریں گے، مورچے پہ لڑنا تو کسی اور کا کام ہے۔ تو یہ شعبہ جو ہے تبلیغ والوں کا یہ تقریباً" ہسپتال کا شعبہ ہے کہ جو مریض آئے اسے کچھ تو مرہم پٹی وہ کر دیں۔ یعنی اسے کلمہ بتا دیا بنیادی باتیں بتا دیں۔ ان سے مورچہ تو نہیں فتح ہوتا۔ جو مورچہ فتح کرنے والے ہیں نا ان کو چاہئے نا کہ وہ ان کی سپورٹ (مدد) لیں۔ وہ لیتے نہیں وہ ان سے الگ ہیں اور وہ ان سے الگ یہ مشکل ہے۔

سوال : کیا مذہبی جماعتوں میں اتحاد ہو سکتا ہے؟

جواب : کوششیں کرنے والے لوگ بنیادی طور پر کم ہیں اور ان میں خلا پیدا کرنے والے لوگ زیادہ ہیں۔ ہر جماعت میں مخلص بھی ہیں لیکن جماعتوں کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی بھی جماعت، ایک طاقت بنتی ہے تو اس میں ایسے لوگ بھی آ جاتے ہیں جو اس سے اپنے دنیوی مفادات حاصل کرتے ہیں۔ اب دیکھیں مکہ مکرمہ میں کوئی منافق نہیں تھا۔ مشکل تھا نا مسلمان ہونا۔ مدینہ منورہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلوہ افروز ہوئے تو ایک اسلامی ریاست بن گئی تو دنیا کا مفاد حاصل کرنے کے لئے منافق بھی ساتھ آ گئے۔ جب بھی کہیں کوئی ایک طاقت بنتی ہے تو اصول ہے کہ کچھ لوگ خلوص سے نہیں آتے۔ محض اپنا مفاد حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ تو اگر یہ رابطہ یا کوآرڈی نیشن ہو جائے تو جو اس طرح کے طالع آزما ہیں ان کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ تو خالص دینی کام ہے نا۔ دنیاوی مفادات تو جاتے ہیں تو اس طرح سے وہ جو طالع آزما طاقتیں ہیں وہ زیادہ ہیں اور یہ سوچنے والے لوگ ہر طرف کم ہیں کہ یہ رابطہ کیا جائے۔ یہ مصیبت ہے۔ ہماری۔ دینی علوم پہلے کم ہیں اور ہمارا تو حال یہ ہے کہ اکثر آپ یہ دیکھیں گے (دیو بندی، بریلوی یا شیعہ، سنی تک آپ چلے جائیں) بیشتر لوگ ایسے ہیں جنہیں بنیادی عقائد نہیں آتے نہ شیعہ کو شیعیت کے بنیادی عقائد آتے ہیں نہ سنی کو سنی کے وہ محض اس پارٹی میں ہے۔ وہ ڈٹا ہوا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں ہے کہ آخرت میں کیا ہو گا؟ کیا یہ حق ہے یا باطل؟ اسے غرض نہیں ہے۔ آپ دیو بندی اور بریلوی کو بٹھا کر پوچھیں تو سوائے پڑھے لکھے لوگوں کے عام آدمی کے پلے کچھ نہیں ہے کہ دیو بندی کیا ہیں؟ بریلوی کیا ہیں؟ لیکن وہ دیو بندی ہے، وہ بریلوی ہے صرف وہ ایک پارٹی میں آ گئے، اپنی پارٹی نبھائے جا رہے ہیں۔ ہم میں اکثریت کے پاس دینی علم بھی کم ہے اور دنیوی اعتبار سے بھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ دنیوی علم بھی نہیں ہے۔ اگر دنیوی علم ہو تو پھر بھی آدمی میں کچھ وہ کامن سنس (Common Sense) (اتنا شعور) تو آ ہی جاتا ہے، وہ بھی نہیں ہے۔ تو یہ بدنصیبی ہے بس۔

سوال : حیلے بہانے سے ویزا لے کر حج پر جانا درست ہے یا نہیں؟

جواب : آپ میرے خیال میں حج کو عبادت سمجھ رہے ہیں۔ تو لوگ عبادت پہ نہیں، یہ لوگ تو پکنک پہ جاتے ہیں۔ حج کو اس ایمان یا اس نظریئے کے ساتھ کہ یہ ایک اسلامی فریضہ ہے جانے والے تو بہت کم لوگ ہیں۔ اکثریت تو پہلے لوگوں کی ہے۔ آپ یورپ جائیں گے تو اس میں وہ فائدے نہیں ہیں۔ اس میں دو فائدے ہیں ایک تو اس کے ساتھ نیکی کی شہرت ہو جائے گی، حاجی صاحب کہلائیں گے اور دوسرا یورپ وغیرہ کی نسبت یہاں ساری چیزیں سستی ہیں۔ یہ میں نے دیکھا ہے کہ ایک چیز امریکہ میں دس ڈالر کی ملتی ہے، وہ چیز برطانیہ میں دس پونڈ کی ملتی ہے، وہی چیز جدے میں دس ریال کی ملتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے یعنی مارکیٹ والوں نے

جو چیز جتنے پونڈ کی ہے اتنے ڈالر کی ہے اور اتنے ہی ریال کی رکھ چھوڑی ہے۔

(جوتا ہے یا کپڑا ہے) اب ڈالر تیس روپے کا ہے' پونڈ پچاس روپے کا ہے۔ برطانیہ میں آ کے خریدا تو اس نے پونڈ کاٹا اور جدے میں آ کر پوچھا تو اتنے ریالوں کا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مڈل ایسٹ کی جو مارکیٹ ہے یہ اوپن مارکیٹ ہے۔ ٹیکسز بہت کم ہیں۔ پھر انٹرنیشنل ریٹنز جو اس ایک فگرز' اس ایک اکائی پہ ہوتے ہیں تو اس اعتبار سے سستی بھی ہے۔ یہاں سے چیزیں بھی خرید لاتے ہیں اور وہ پیسہ بھی رشوت ہی کا ہوتا ہے کہ حلال کا پیسہ اتنا کہاں ہے کہ وہاں سے آدمی جہاز بھر کے لے آئے تو خریداری بھی ہو گئی آؤٹنگ بھی ہو گئی' ساتھ نیکی کا لیبل بھی لگ گیا۔ تو وہ جو رکن ہے اسلام کا یا جسے فرض سمجھا جاتا ہے وہ ادا نہیں ہوتا۔

بیت اللہ شریف کی تاریخ میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن میں بیت اللہ کو شہید کر کے اہل مکہ نے دوبارہ تعمیر کیا (عمارت ابراہیمی مستطیل تھی مربع نہیں تھی اور یہ جو حطیم ہے یہ عمارت کا حصہ ہے۔ اس لئے اس کے باہر سے طواف کیا جاتا ہے بلکہ طواف میں حطیم کی دیوار پہ ہاتھ رکھا جائے تو طواف صحیح نہیں رہتا کیونکہ وہ ہاتھ کعبے کے اندر چلا جاتا ہے اور طواف گردا گرد کرنا چاہئے۔ عموماً" لوگ پاس سے گزرتے ہوئے اوپر ہاتھ رکھ دیتے ہیں وہ نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ وہ ہاتھ بیت اللہ کے اندر چلا جاتاہے۔ دیوار جو ہے وہ حد ہے وہ بیت اللہ کی) جب شہید کی ہوئی عمارت بہت مخدوش ہو گئی اور خصوصاً" چھت جو تھا وہ ختم ہو گیا تو قریش نے اس کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کیا۔ روسا قریش نے اعلان کیا (ابھی اسلام کا ظہور نہیں ہوا تھا اور نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا بچپن تھا) انہوں نے کہا "بھئی دیکھو! یہ اللہ کا گھر ہے اور ہم جیسے بھی ہیں کم از کم اللہ کے ساتھ ہمیں کھرا رہنا چاہئے اور جو بندہ بھی چندہ دے وہ' وہ رقم دے جس پر اسے کوئی شبہ نہ ہو۔ جوئے کا نہ ہو' شراب کی کمائی نہ ہو' چوری کا نہ ہو' ڈاکے کا نہ ہو' برائی کا حاصل نہ ہو وہ پیسہ دیں جس پر آپ کو شبہ نہ ہو کھرا اور حلال کا ہو۔" یہ مشرکین نے اعلان کیا تھا۔ تو جو چندہ جمع ہوا وہ اتنا کم تھا کہ اس سے بیت اللہ کی عمارت نہیں بن سکتی تھی۔ تب انہوں نے سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ کچھ حصہ عمارت کا چھوڑ دیا جائے اور دیوار بنا کر اس کی نشان دہی کر دی جائے اور جتنے پیسے ہیں اتنی عمارت بنا دی جائے۔ تب یہ عمارت چوکور بنائی گئی اور ساتھ وہ حصہ چھوڑ دیا گیا۔ یعنی وہ جیسے بھی تھے اس معاملے میں وہ کھرے نکلے کہ اللہ کی راہ میں یا بیت اللہ پہ جو پیسہ لگتا ہے اس میں شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ اب جو بندہ رشوت' چوری یا چھینا جھپٹی کے پیسے لے کر حج پر جا رہا ہو اس کا مطلب ہے کہ وہ اللہ کو اتنا بھی نہیں مانتا جتنا وہ مکہ کے مشرک مانتے تھے تو آپ حج پہ جانے والے کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ وہ دین کا رکن ادا کرنے جا رہا ہے۔ حالانکہ لوگ پکنک پہ جا رہے ہوتے ہیں۔

سوال : شیخ سے اخذ فیض کا بہتر طریقہ کیا ہے کیا یہ شیخ ایک توجہ میں سب مقامات کرا سکتا ہے؟

جواب : ہم نے تو بحمد اللہ ایسے ہوتے دیکھا ہے۔ اس مین دو چیزوں پہ انحصار ہوتا ہے۔ ایک تو ہوتی ہے وہ ہستی جو فیض دے رہی ہے۔ جیسے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات والا صفات بے مثل و بے مثال تھی' منبع نور تھی۔ دوسرا ہوتا ہے کہ طالب میں فطری استعداد اور اس کا اپنا خلوص۔ یہ دو باتیں طالب میں ہونی چاہئیں۔ بعض لوگوں میں خلوص بہت ہوتا ہے لیکن بنانے والے نے استعداد کی ایک حد رکھی ہوتی ہے۔ جیسے آئی سائٹ (بینائی) ہے اس کا کمال ایک حد ہے۔ جیسے آدمی یوں تو صحت مند ہے لیکن اس کی آئی (بینائی) سائٹ کی ایک حد ہے۔ یہ کوئی بیماری نہیں۔ تخلیق طور پر اس کی ایک لمٹ (حد) ہے۔۔ ایک آدمی تین میل تک دیکھ سکتا ہے' دوسرا ڈیڑھ میل تک دیکھتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کو حاصل کرنے کے لئے ایک فطری استعداد ہوتی ہے اور

اب اس استعداد کو بروئے کار لانے کے لئے اس کا اپنا خلوص چاہئے تو یہ دو باتیں طالب میں اگر ہوں اور دینے والے میں، فیض بانٹنے والے میں بھی دینے کی اتنی استعداد ہو تو یہ ہو جاتا ہے۔ میں حضرت رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ تین سال تک لطائف کرتا رہا۔ مراقبہ احدیت تین سال بعد نصیب ہوا اور میرے لطائف کرنے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ عموماً" رات کو ایک بجے اٹھتا تھا اور سردیوں کی راتوں میں ایک بجے اٹھ کر چھ بجے تک لطائف کرتا تھا (چھ بجے میں فجر پڑھتا تھا) نوافل پڑھنے کے بعد چار چار گھنٹے مسلسل لطائف کرتا تھا۔ دن کو، پھر رات کو۔ شام کو کر کے سونا۔ ہمارے ساتھ ایک ساتھی آئے اور وہ حضرت رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس چھ دن ٹھہرے۔ ساتویں دن جب وہ وہاں سے رخصت ہوئے تو وہ فنا بقا، فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سالک المجذوبی تک منازل مکمل کر چکے تھے۔ اسی طرح حضرت رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ ڈھلیاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک صاحب زادہ صاحب آ گئے میرے خیال میں تین ذکر میں انہوں نے شمولیت کی۔ مراقبات ثلاثہ انہیں ہو گئے، مشاہدات بھی ہو گئے ہم بیٹھے منہ دیکھا کرتے تھے۔ وہ اپنے مشاہدات سناتے تھے ہم نے تو یہ ہوتے دیکھا ہے اب یہ الگ بات ہے کہ ہمیں خود یہ کتنا کرنا پڑا۔

کچھ عجیب بات ہوتی ہے من جانب اللہ۔ پتہ نہیں قدرت کو کیا منظور ہوتا ہے؟ اور اس پہ وہ کیا نتائج مرتب کرنا چاہتا ہے؟ بالاخر وہ سارے لوگ بہت پیچھے رہ گئے۔ یعنی انجام کار میں وہ لوگ ہماری گرد کو بھی نہ پا سکے۔ شروع میں یہ ہوا کہ ہم تین سال تک ساری ساری رات، سارا سارا دن لطائف کرتے رہے وہ آگے چلے گئے۔ ایسے بھی میں نے دیکھا ہے کہ ایک بزرگ تھے۔ بابا جی بابا دوست محمد نام تھا ان کا۔ اور بے چارے بالکل سادے، ان پڑھ تھے۔ بوڑھے آدمی تھے۔ ہمارے ساتھ لطائف میں شریک ہوئے ہم لطائف بھی کرتے تھے کہ وہ فنا بقا تک چلے گئے پھر میں نے حضرت سے درخواست کی کہ حضرت بابا فارغ ہے اسے آپ ہمارے ساتھ بھیج دیں ہمیں ذکر کرایا کرے تو انہوں نے فرمایا کہ جو ذکر کراتا ہے وہ تو شیخ کا قائم مقام ہوتا ہے تمہارا یہ ہم سبق ہے، تمہاری اس کے ساتھ بے تکلفی ہے، مذاق کرنے کی عادت ہے تمہاری، تم اس سے مذاق کرو گے، تمہارا نقصان ہو گا۔ میں نے کہا نہیں حضرت مذاق کرتے تھے جب ہم سبق تھا۔ جب ہمیں یہ سکھائے گا تو پھر تو ہمارا استاد ہو گا، ہم ادب کریں گے پھر وہ میرے ساتھ رہے وہ لطائف کرایا کرتے تھے۔ اس طرح تو چلتا رہتا ہے۔ اب یہ مالک ہی جانیں۔ ویسے ہوتا ہے ہم نے ہوتے دیکھا ہے۔ شاید آئندہ ہو نہ ہو لیکن ہم نے ہوتا دیکھا ہے۔

سوال : ذکر میں کیا خیال کرنا چاہئے؟

جواب : ذکر جب ہوتا ہے تو وہ خود ہی خیال کروا لیتا ہے۔ بس ہو جائے سہی۔ جب تک توجہ اپنے بس میں رہے تب تک یہ پتہ چلتا ہے کہ ابھی ذکر خام ہے۔ جب ذکر میں پختگی آتی ہے تو پھر توجہ اپنے بس سے نکل جاتی ہے پھر اس طرف چلی جاتی ہے۔

سوال : بعد از وصال اہل اللہ قبور سے تصرف کر سکتے ہیں؟

جواب : اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ تصرف سے مراد کیا ہے؟ تصرف سے مراد ہے فیضان پہنچانا۔ جہاں تک ہے فیض پہنچانے کی بات اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام قبر اطہر میں تشریف فرما ہیں اور نبوت انہی کی جاری و ساری ہے۔ کائنات میں سارا فیض انہی کا ہے۔ اگر فیض سے مراد برکات ہیں، دین ہے، نیکی ہے تو پھر رابطہ شرط ہے جیسے کلمہ پڑھنے والا، خواہ کوئی کافر بھی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے تو رابطہ اس کا ہو گیا۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی برکات اسے پہنچیں گی۔ وہ مسلمان ہو گیا، مومن ہو گیا، ایمان نصیب ہو گیا۔ تو اہل اللہ بھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین مبارک کی خاک ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیض کو آگے پہنچانے والے ہیں اس میں تو کوئی شبہ نہیں اگر فیض سے مراد دنیاوی امور لئے جائیں تو میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ ہم نے تو اہل اللہ کو

دیکھا ہے وہ زندگی میں دنیا کے کاموں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ مر کر کیا کریں گے بھائی؟ انہیں کیا فکر پڑی ہے کہ برزخ میں سے کسی کے لئے دنیا کی فکر کرتے پھریں؟ ہاں دین کی بات کریں چونکہ ان کے نزدیک تو اہمیت ہی دین کو ہوتی ہے۔ جہاں تک دینی برکات ہیں ان میں شبے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ آپ دیکھ لیں نبی علیہ الصلوۃ والسلام قبر اطہر میں تشریف فرما ہیں اور کائنات کو برکات پھیل رہی ہیں۔ کہاں سے آ رہا ہے؟ دین کس کی برکت نبوت ہے؟ ہے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اس میں تو کوئی شبے کی بات نہیں اور دنیاوی امور میں اہل اللہ کو گھسیٹنا یہ ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہ جب دنیا میں مقیم تھے تو یہاں کی سردی، گرمی نقصان برداشت کرتے رہے، تکلیفیں برداشت کرتے رہے اور دنیوی امور میں مداخلت انہوں نے پسند نہیں کی۔ خود نقصان اٹھاتے رہے اور اس میں مداخلت پسند نہ کی تو قبر سے اٹھ کر کون آئے گا۔ دنیاوی امور میں مداخلت کرنے؟ ان کی شان بہت بلند ہے۔

سوال: کیا کسی قبر پر جا کر دعا مانگنا چاہئے؟

جواب: اگر دعا مانگنے والے کو یہ قوت حاصل ہو کہ وہ برزخ میں پہنچ کر بات کر سکتا ہو۔ کوئی وہاں تک جا تو سکتا ہو نا! تو جسے یہ قوت ہوتی ہے اسے بات کرنے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے جسے اللہ یہ توفیق دیتا ہے اسے بات کرنے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے اور جسے نہیں دیتا تو جب اللہ موجود ہے مانگنے کے لئے تو کیوں دھکے کھاتا ہے؟ بے شک اہل اللہ مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اللہ کو یہ بڑا پسند ہے کہ اس کا بندہ اس سے مانگے یہ بات اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے یہاں کسی سے کہہ دیا جائے کہ "بھئی میں بھی دعا کرتا ہوں تم بھی اپنے لئے دعا کرو۔ وہ ناراض ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے جی آپ ہمارا کام نہیں کرنا چاہتے۔ فلاں کی طرف چھٹی لکھ دو فلاں افسر کو فون کر دو، فلاں کو کہہ دو ہو جائے گا اللہ پہ کوئی بھروسہ نہیں ہے میری عادت ہے کئی سفارشی آتے ہیں جن کی سفارش میں رکھ لیتا ہوں میں کسی افسر سے نہیں کہتا، میں اللہ ہی سے کہتا ہوں۔ اس کا کام ہو جاتا ہے جس کا کسی افسر سے کہا جائے اس کا نہیں ہوتا۔

ہمارے عہد میں بہت ہی کمزوری آ گئی ہے ایمانوں میں، عقائد میں، نظریات میں اس کا اثر کردار پہ بھی پڑتا ہے۔ لہٰذا اب اتنی جرات نہیں رہی لوگوں میں کہ وہ کسی ان دیکھے خدا پہ اعتبار کریں۔ نظر کے سامنے خواہ پتھر آ جائے اس پہ اعتبار کر لیتے ہیں۔

سوال: ذکر میں نیند آ جاتی ہے اس کا کیا علاج؟

جواب: انسان کمزوریوں کا مجموعہ ہے ایک سے چھوٹے گا دوسری آ جائے گی۔ اس سے چھوٹے گا تیسری آ جائے گی۔۔ ان چیزوں میں سے کوئی بھی دائمی نہیں ہوتی۔ یہ وقتی چیزیں ہوتی ہیں بعض جسمانی عوارضات کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی ذکر کرنے بیٹھتا ہے تو ذہن کو سکون بھی ملتا ہے اس کی وجہ سے بھی غنودگی آ جاتی ہے کہ ہر طرف کی اس مارا ماری سے تھوڑی دیر اسے آرام و سکون نصیب ہو جاتا ہے ذکر میں کوشش یہ کرنی چاہئے کہ لطائف میں غنودگی نہ آئے مراقبات میں آتی بھی رہے تو خیر ہے مراقبات میں غنودگی آ جائے تو وہ مفید ہوتی ہے لطائف میں آ جائے تو پھر نقصان کرتی ہے کہ وہ لطائف میں تو ایک مجاہدہ ہے غنودگی سے اس میں کمی آ جاتی ہے۔ تو کوشش کرنی چاہئے کہ لطائف میں بندہ تگڑا رہے۔

مکان برائے فروخت

اوسیہ سوسائٹی لاہور میں اکنال پر مشتمل مکمل مکان برائے فروخت ہے۔ صرف سلسلہ عالیہ سے منسلک افراد رجوع فرمادیں

برائے رابطہ: چوہدری محمد برکت۔ سوسائٹی انجینئر

فون نمبر: 5113956

NOTES

27. Britannica, Micropaedia, Vol X p. 886.
28. Hans Khon,"Zion and the Jewish National Idea." The Menora Journal, Autumn, 1958, p.23.
29. Alan R. Taylor, "Prelude to Israel," the Institute of Palestine Studies, Beirut, 1970, p.xii.
30. Burton Thurston, "The Kingdom of God And Zionist Claims," "Christians, Zionism and Palestine," the Institute for Palestine Studies, Beirut, 1970, p. 29.
31. Ibid., p. 35.
32. Taylor, p.xiii.
33. Ibid, p.7.
34. Britannica, Micropaedia Vol. V, p. 552.
35. Taylor, p. 4.
36. Jacob C. Hurewitz, "Diplomacy in the Near and Middle East, a Documentary Record," Princeton, New Jersey, 1956, p. 209.
37. Taylor, p. 6.
38. Zionist Year Book 1988, the Zionist Federation of Great British and Ireland, London, 1988, p.37.
39. Jewish Chronicle, London, September 23, 1994, p. 48.
40. Roger Garaudy, "The Case of Israel: A Study in Political Zionism," Shorouk international, London, 1983, p.134.
41. The News, November 6, 1991, p.1.
42. AFP, The Muslim, November 17, 1994.
43. AP, The Muslim, November 22, 1994, p. 12.
44. The News, November 19, 1994, p.1.
45. The Muslim, November 23, 1994, p.1.

This article was published in the Strategic perspectives, Autumn 1994, Vol. 2, Number 4, by the Institute of Strategic Studies Islamabad, but nearly half of it, including the key sections i.e. Arab Politics, Status of PLO and Characteristcs of the State of Israel, was excluded from publication.

اول حلال کا اہتمام اور صحبت بد سے احتراز کے بعد کرنے کا کام یہ ہے کہ پوری یکسوئی سے نہایت پابندی سے ذکر الٰہی کریں۔ پوری قوت سے، تیزی سے سانس کے ذریعے ذکر کریں۔ اس قوت اور تیزی سے دو اثر مرتب ہوتے ہیں۔ اوّل توجہ ایک مقصد پہ مرتکز رہتی ہے۔ دوم خون میں خاص گرمی پیدا ہوتی ہے۔ جو اخذ فیضان کے لیے اور جذب انوارات کیلئے ضروری ہے۔ اگر یہ گرمی پیدا نہ ہو تو شیخ کی توجہ سے انوارات آتے تو ہیں مگر طالب کے قلب میں جذب نہیں ہو پاتے۔ جب انوارات میں جذب نہ ہو منازل سلوک طے نہیں ہو سکتیں۔ ہاں ذکر الٰہی کا ثواب ہوتا رہتا ہے۔ محض ثواب ملنا اور بات ہے۔ اور منازل قرب کی طرف بڑھنا اور بات ہے۔

(حضرت مولانا محمد اکرم)

(10) *Increased Militancy in Muslim Circles*

A direct consequence of the above-mentioned offensive front would be a rapid increase in organized Muslim groups and parties which being anti-US and anti-Israel would be the target of the Israel-Arab Elite front. A movement to put into practice the concept of Jihad is already gaining popularity and momentum in Arab/Muslim states and the Muslim communities elsewhere in the world. Regardless of the fact that fake, opportunistic and trained subversive elements have become a part of it, the jihad movement is carried by dedicated genuine supporters, who would not be easily put down by the Israeli-Arab Elite front. The conflict therefore would likely be severe, long and disastrous.

Conclusion

The PLO-Israeli accord has caused a major upset in Arab politics that threatens to engulf the Muslim countries beyond the Middle East. Even a cursory look at the contents of the accord and at the Palestinian scene can point to the serious implications of the accord on Arab politics. Indeed, several of the implications, such as disillusionment of the Arab masses with the accord which is heavily weighted in favour of Israel; confrontation between PLO and the anti-accord Hamas movement, with sharp overtones of an intra-Arab conflict; emerging Israeli political and economic hegemony over the Arabs; and growing pressure on Arab states to recognize Israel, have already taken shape.

A proper study of the nature of the components, of this article's topic, i.e. the accord, Arafat's PLO, Arab politics and the state of Israel, reveals a far more serious picture of the implications of the accord. The most important factor from the study turns out to be the extraordinary nature, characteristics and strategic interests of the Israeli state or, more accurately, of its governing body, the World Zionist Organization.

It discloses the political power of organized Zionist Jewry and its ability to pursue long-term aims which include destabilization and disintegration of Arab/Muslim states. On realizing these aspects it becomes apparent that the PLO-Israeli accord is in line with the Zionist long-term aims, and is meant to produce designed conditions and effects which, as the current developments corroborate, are already taking place! The accord's implications, many of which are identified or alluded to in this writing, should, therefore, be studied with the minutest care, and indeed with the greatest concern, by the Arab/Muslim political leaders and policy planners, in order to stem and counter Israeli/Zionist multiple onslaught against their nations. The first requirement for them, following an understanding of the Israeli/Zionist game, will be to forge unity in their politics.

○ انسان ہی دنیا میں حالات کو بدلتے ہیں۔ فرشتے نہیں۔

called peace plan. As explained above, the vast majority of the Palestinians, and more so under the growing influence of the Hamas movement, have rejected the accord and the PLO leadership. This natural division, coupled with planned instigations to both sides by the Israelis, has set the stage for an armed conflict amongst the Palestinians. The circumstances in the Arab world are such as this conflict would inevitably spill over to all the Arab states. The conflict, in effect, would turn into a confrontation between those who oppose the Israeli-US domination and those who support or condone it. This polarization, already existing, has been widened since the PLO-Israel accord. The factor of Israel and Zionism has come in sharper focus.

Not just the Palestinians but the Arabs every where are compelled to take sides. In the process the anti-Israel group has become quite a force. In addition, the religious groups such as Hamas, Ikkhwan al-Muslemen, Islamic Solidarity Front etc., operating in different countries are likely to link up with each other. Another set of Muslim revolutionaries opposed to Israel and the US is also in existence. There are more than half a dozen large organizations of Mujahideen who grew out of the Soviet-Afghan War and are currently engaged in fighting in Kashmir and Bosnia. It is logical to forecast that these groups would also join with the anti-Israel force rising from amongst the Palestinians.

Since the massacre of innocent Palestinians in Ibrahimi Mosque in Hebron, in February 1994, by an Israeli terrorist, there has been a spate of incidents constantly raising the level of conflict between PLO and its Palestinian opponents. A most serious escalation occurred on November 18. According to the story: "Palestinian police force shot dead fourteen and wounded upto 200 in clashes in PLO-ruled Gaza, in order to prevent an Islamic opposition rally. The shooting after Friday prayers at a mosque in Gaza City was the worst internal Palestinian violence since Yasser Arafat's PLO began self-rule from Israel in the Gaza Strip in May 1994"(44). Even casual observers can imagine the mutually destructive nature of this conflict. Serious thinkers can visualize this armed confrontation spreading to the other Arab states and leading to catastrophic results for their integrity.

(9) *Israel-Led Front against Anti-Israel Muslims*

Israel is doggedly pursuing plans to stamp out all elements of opposition to it in the Arab/Muslim states. After gaining diplomatic, political and economic access into the Arab states, Israel intends to form a joint front with the ruling elite of these states to chase and eliminate these elements who would be projected as the enemies of the ruling leaders. Such a front already seemed in the offing, as one press report, on November 23, stated: "PLO, Israel, Egypt, Jordan and Algeria have joined hands against Hamas and other Islamic groups functioning in the United States...In active collaboration with the anti-Islamic media, the authoritarian regimes in the Middle East have produced a documentary "Jihad in America"(45). The more the Arab/Muslim leaders align themselves with Israel, the more the masses in their countries would turn against them. The consequences would facilitate the Zionist schemes mentioned earlier.

(6) *Alienation between Arab States and Pakistan*

Close relations between Pakistan and most of the Arab states have always been a sore point for Israel and it has been maneuvering through international diplomacy and propaganda to create misunderstanding and estrangement between Pakistanis and Arabs. In a few instances concerning Pakistan's relations with Egypt and Libya, the Zionist policy managed to achieve some success also. The US has also been espousing this policy. The climate to further advance this policy has become highly favourable for Israel, It is not accidental that it was immediately after the PLO-Israeli accord of September 1993, that incidents marring Pakistan-Arab relations suddenly began to appear. The Arab countries were blamed for Pakistan's diplomatic debacle over the Kashmir Issue at the UN Human Rights Commission in Geneva in January 1994.

Similar negative effects were created in November 1994 when an OIC Contact Group decided not to table its draft resolution on Kashmir at the UN General Assembly. In both incidents, US underhand involvement was alleged. Whatever the truth on the two occasions, a divergence of Arab politics from Pakistan's interests was indicated. A propaganda theme that Pakistan's close support to Arab interests has been the main cause of Israeli enmity to Pakistan -- which of course is patently false - and since the Arab states do not care for Kashmir, Pakistan should drop its commitment to the Palestine Issue, is being promoted for the same purpose. An aggravation in Arab-Iran differences would also depress Arab-Pakistan relations. In the future environment, Israeli capacity to directly or indirectly turn the Arabs and the Pakistanis further away from one another will be greatly enhanced. If Israel is allowed to succeed, the consequences for the traditional allies would be gravely damaging.

(7) *Compulsion on Syria and Lebanon for Settlement with Israel*

The PLO-Israeli accord, while blocking the options of the other parties in the dispute, Jordan, Syria and Lebanon, to choose their own terms and timing for settling their problems with Israel has driven them helter-skelter to yield to Israeli pressure for reaching agreements. Jordan has already succumbed to pressure and signed an agreement with Israel. Syria and Lebanon cannot hold out for much longer. Israel already has a plan for the Golan Heights, presently reckoned as the stumbling block in an Israeli-Syrian agreement. The plan envisages making the Golan Heights an autonomous area under the rule of the Druzes. The Druze community, already inhabiting the Golan Hights, has been further enlarged by shifting the Druzes residing in the Israeli territory to the Golan Heights area. The package on setllement with Syria would be deceptively shaped, like the packages offered to PLO and Jordan, and would be accepted by Syrian President Hafez Asaad who has adopted a new stance of amity towards US and Israel which he exhibited during President Clinton's visit to Syria on October 27. An Israeli-Syrian agreement would clear the way for an Israeli-Lebanon settlement.

(8) *Intra-Palestinian and Intra-Arab Conflict*

Israel achieved a great success in weaning the PLO from the Palestinian masses and their main stream liberation movement, and making it a partner in the so-

of industries and natural resources including the oil and gas fields, and elimination of all state participation in the economic programme.

This phase also envisages replacement of Arab/Muslim mass labour by non-Muslim labour force. These features are presaged by the ongoing Israeli measures of economic strangulation, of the West Bank Palestinians, under which work permits of Palestinians were cancelled and thousands of workers from Thailand, Korea etc. are being imported.

The structure had, in fact, been laid in the late 1970s when giant construction and industrial projects were started by the wealthy Arab states in partnership with multinationals. It has been vastly strengthened and expanded since the American-Iraqi War, and the Jewish factor in the programme has been made overt. The MENA summit was a big step in the same scheme. Israel is only waiting for the appropriate time. Immediately after Israel establishes diplomatic ties with the GCC states, the programme would be put into high gear, and the scheme would even be tactfully made public. The MENA summit has opened the gates to whole-scale privatisation. The Arab world is going to experience the same inexorable process of privatization that is being forced on the Islamic Republic of Pakistan. Privatization is meant to give multinationals the control of all major national assets including industries, utilities, services, ports, natural resources, and valuable land, and thus the control of the economic and social environment that decides the politics and security of the states and the well-being of their people.

(4) *More Subservience of Arab Politics to US Interests*

Since the American-Iraqi Crisis, Arab politics has been coming under growing US influence. The conditions created by the Washington accord have further accelerated this process. A stage is reaching when, with the present pro-US rulers in position, Arab politics in all spheres including strictly domestic matters will be directly shaped by decisions made in Washington. This will impact on the Arab states' relations with the other Muslim countries, notably, Iran and Pakistan, with whom a negative change in relationship will benefit Israel.

(5) *Widening of Arab-Iranian Rift*

Differences between Arabs and Iranians have all along been fuelled by a deliberate policy of US/Israeli interests. With its greater clout, the US would sharply bend Arab politics to make it more anti-Iranian. It would naturally elicit sharp responses from Iran. The process will widen the Arab-Iranian rift. A direct clash between the two parties, and more ethnicised than the Iraq-Iran War was, would ideally suit Israel, and is very likely to be a part of the Zionist global game. Presence of Israeli diplomats in Arab capitals will hasten the invidious process. Iran is a regular target of accusations by Israel. Now Arafat has joined Israel. "Arafat accused Iran of meddling in Palestinian affairs. 'We will not allow any force that is getting orders from outside to harm the Palestinian dreams, Arafat told his supporters on November 20".(43)

visible, in mid-November 1994, when the arrival of the US Assistant Secretary of State Mrs Robyn Raphel in Pakistan was followed, three days later, by that of Foreign Minister of PLO Farooq Kaddoumi. The two of them were in Pakistan on November 16 when the widely-circulated local Urdu daily Jang, under an unprecedented banner headline favouring Israel, carried an interview, with its London-based correspondent, of a director general of the Israeli foreign ministry, in which the Israeli diplomat made a strong plea for establishment of relations between Israel and Pakistan!

In the Zionist/Israeli strategic schemes, events are brought about according to planned timing. It can therefore be expected that before long the US, on a Zionist signal, would give the final push to Pakistan and its Arab satellites to announce their recognition of Israel. The event would generate mass opposition movements, in the countries recognizing Israel, with inevitable consequences of economic retardation, civic life disruption, and armed confrontation between civil elements and the security/armed forces. A fact that the Arab/Muslim states must not forget is that recognition of the Zionist state by them will not change at all the Zionist aims against them, but will certainly facilitate and accelerate the Zionist schemes to attain the aims.

(2) *Unrestricted Movement of Israeli and other Jews in the Arab World*

Since the American-Iraqi War, Jews from the Western countries and CIS states, and even from Israel, using American passports, have been moving into the Arab countries, but without disclosing their Jewish identity. After recognition of Israel, they will feel free to disclose their identity which would increase the tension between the anti-Israel elements and the Arab ruling elite. There would be a brisk movement among the Israelis to converge in the Arab states. The large number of Jews of Arab origin who themselves or their elders had migrated to Israel in 1948 are ready to be sent back to their former lands of residence. They speak the Arabic language and, being at home with Arab culture, will be able to advance the Israeli interests with great ease. Israeli sources have also forecast a flood of Jewish tourists to the Arab states following their recognition of Israel. Jewish tourism would create its own ill-effects on Arab life.

(3) *Israeli Economic Hegemony*

A study of Zionist/Israeli literature on political and economic goals reveals that Israel has a comprehensive scheme for gaining economic hegemony over the Arab world. The scheme consists of two phases. In the first phase a structure for economic-industrial programme would be constructed along four mainlines: investment capital from the oil-rich Arab states, mass labour from the poor Arab and non-Arab states, technological and skilled staff from amongst Jews and Zionist-oriented non-Jewish people mainly from the Western countries, and advanced management and executive control by Israeli Jews. In the second phase, the ownership of all projects, industrial plants and economic resources in the area would be acquired by transworld corporations owned by Israeli Jews, by high level financial manipulation, privatization

In November 1991, immediately after the Middle East conference in Madrid, "Israeli prime minister, Itzhak Shamir, said in an interview that Israel shall expand its boundaries over an area extending from Egypt in the south to Turkey in the north, and it would include most of Syria, Iraq, Saudi Arabia, Lebanon, Jordan and Kuwait" (41). The PLO-Israeli accord is designed to serve Israel ideally to advance both of the schemes, i.e. break up of Arab/Muslim states and expansion of Israel. The lethal repercussions of the accord, especially as these are not being understood and therefore remain un-countered, will critically destabilise the Arab/Muslim states ripping them apart internally. Recognizing the state of Israel, and thus acknowledging its claim on the Arab territories already captured and annexed by it, will tantamount to conceding its claim to expand to the boundaries of 'Eretz Israel'.

Implications of the Accord

As discussed above the PLO-Israel accord is methodologically designed to produce numerous effects against the Arab countries, and in favour of Israel's strategic aims. Several of its implications such as intra-Palestinian conflict and economic suppression and subjugation of the Palestinians by Israel are built-in within the accord. Resulting directly from the accord are certain implications, for example recognition of Israel by Arab states, and bilateral treaties or normalization of relations between these states and Israel, which will produce their own significant off-shoots to overwhelmingly influence Arab politics. An attempt has been made in the foregoing discussion to bring to light most of the implications. Of these, the more potent, as catalysts of change, are further identified below.

(1) *Recognition of Israel*

The accord opened the way for Israel to obtain formal recognition for itself from all the Arab states. Although till the time of this writing, that is November 1994, only two states, Jordan and Morocco, had extended diplomatic recognition to Israel; yet the pressure on the other US-allied Arab states to move in that direction was intense. Recognizing Israel would be the most serious implication, and from it will result many destabilising effects on Arab states. Jordan has been experiencing these since signing its agreement with Israel on October, 26. Jordanian masses, considered to be exceptionally moderate in political behaviour and very loyal to their king, have reacted sharply against the treaty, leading "King Hussein to vow, that Jordan will protect the peace it made with Israel and will not allow its land to serve as a base for the enemies of peace"(42). It heralds the destabilisation of King Hussein's monarchy whose subjects have a big proportion of Palestinians who largely oppose Israel and support Hamas.

The Arab states are not unaware of the difficulties that will follow their recognition of the Zionist state. They are trying to delay it as long as possible and are also working to reduce the trouble-making potential of the opposing forces. One strategy is to make Pakistan take the first plunge. The United States, Israel and the PLO are collectively working on coaxing Pakistan to recognize Israel. The PPP regime of Ms Benazir Bhutto has dropped hints that Pakistan could accord diplomatic recognition to Israel. An orchestration of moves in this respect was

Israeli prime minister, Ben-Gurion in a policy speech delivered to the Jewish community in Paris after the 1967 War. According to London's Jewish Chronicle of August 9, 1967, Ben Gurion announced: "The World Zionist Organisation should not be neglectful of the dangers of Pakistan to it".

"And Pakistan now should be its first target, for this ideological state is a threat to our existence. India is the most important base for us to work therefrom against Pakistan. It is essential that we exploit this base and strike and crush Pakistanis, enemies of Jews and Zionism, by all disguised and secret plans." It is relevant to reproduce here from an outline scheme, envisaging disintegration of Muslim states, which was aired in February 1982 in the Zionist review "Kivunim" (Directions) published by the WZO and which was included in full by French Muslim convert Roger Garaudy in his scholarly work on Israel and political Zionism, as a warning to all the Muslim states:

> ***"Owing to its internal conflict Egypt does not constitute a military-strategic problem, and it could be driven back in a day or two to the position it was in after the war of June 1967. In its existing domestic political image, Egypt is already a corpse, all the more so if we take into account the growing rift between Muslims and Christians. Breaking Egypt down territorially into distinct geographical regions is the political aim of Israel. If Egypt falls apart, Libya and Sudan, or even the more distant states, will not continue to exist in their present form. The total dissolution of Lebanon into five provinces serves as a precedent for the entire Arab World. The break up of Syria, and Iraq later on, into ethnically or religiously homogeneous areas is Israel's primary long-run aim, with the destruction of the military power of those states as the primary aim for the short run. Syria will fall apart, in accordance with its ethnic and religious structure, into several states. Iraq, torn by internal conflicts, is firmly in Israel's sights. Dissolution of Iraq is even more important for us than that of Syria. Iraq will break up into three or more states - around the three major cities Basra, Baghdad and Mosul, while Shiite areas in the south will separate from the Sunni and Kurdish north. Every kind of inter-Arab confrontation will assist us. The entire Arabian peninsula is a natural candidate for dissolution through pressure from within and without. This is bound to happen especially in Saudi Arabia".(40)***

Events are alarmingly shaping in that direction. Breaking up of Iraq is on the anvil, with the country already divided in three parts; autonomous Kurdistan in the north and Shiite region in the south stand excluded from Iraqi suzerainty and are under UN/US protection. It may be noted that the expression 'the more distant states' in the scheme refers to Iran, Afghanistan, Pakistan etc.

It should be remembered that the Zionists propounded a biblical 'claim' for creating a state for Jews in Palestine; and that in the same 'claim' is built a justification for an expanded state of Israel - what the Zionists call 'Eretz Israel'. They keep drumming on the expansionist theme.

The second statement, made at the 27th Zionist Congress Jerusalem in June 1968, announced five major aims: "(1) unity of the Jewish people and the centrality of Israel in Jewish life, (2) the ingathering of the Jewish people in its historic homeland, Eretz Israel, through Aliyah (immigration to Israel) from all countries; (3) the strengthening of the State of Israel; (4) the preservation of the identity of the Jewish people; and , (5) the protection of Jewish rights everywhere".(38)

These few details have been presented to indicate how the tiny state of Israel is able to force its will on the international community, what gives Israel the right to claim financial support and unflinching loyalty of the Jews settled in the countries around the world; how the WZO controls the policies of the Western countries and of many others including Brazil, Argentina, Australia, South Africa, Kenya, Morocco, Syria and Iraq where local Jews exercise political power and hold key positions; how the WZO can wield the powerful international resources owned by Jewish companies; what makes the WZO capable of carrying out mega-time advance planning and what the WZO aims to achieve globally?

It is only with this background that one can fully understand why British premier, John Major, rushed to Saudi Arabia and UAE in September 1994, ahead of MENA conference, and "made personal plea to King Fahd and Sheikh Zayed to end the Arab trade boycott against Israel,"(39), or why the US president's closest advisors on Middle East are so committed to Israeli interests? Disclosing one case, in the Washington Report on Middle East Affairs (march 1993), Grace Halsell, a noted analyst, wrote: "President Clinton's appointment of Martin Indyk as National Security Council Middle East advisor (in February 1993) is not the first time this former employee of Israel's principal Washington DC lobby, the American Israel Public Affairs Committee (AIPAC), has occupied a key policy making position. Indyk has served as Middle East advisor to the prime minister of Australia, and as an international media and communications advisor to former prime minister, Yitzhak Shamir, in Israel."

Its ability to exert formidable political and economic influence internationally has expanded the aims and interests of the WZO. It is, thus, engaged world-wide, in a global game, to make Zionism the leading ideology and Israel the leading power in the world. Until a few years ago it looked like a preposterous idea to most people, but thoughtful observers can see now that if current international trend, characterized by unswerving American and European support to Israel, and a deepening vulnerability of the Muslim states continued, the WZO may realize its ambitions.

Amongst WZO's main strategies are: establishing Israel, initially, as the recognized dominant power in the Middle East, and expanding its area and economic and military power while reducing the same for the Arab/Muslim states, making these states lose the ownership of their national economic assets to multinational companies by the strategem of privatization, cultivating their top leaders to make them adopt national slef-annihilation policies, and breaking them up, as also the other countries in the world, into mini-states or Cantons. It is a point to be noted that the WZO, well understanding the potential in Islamic ideology for generating political power, looks upon Islam and its genuine followers as the only remaining major obstacle in its way to global political control. The principal Muslim countries with high power potential such as Pakistan are therefore its primary targets. An early proof of this was given by

retained even after 1951, when the Jewish Agency became legally identified with the WZO".(34)

The most important point to note about Israel is that in reality the state is ruled and directed by the World Zionist Organization which has its principal headquarters in Jerusalem. Chaim Weizmann's (head of the WZO) becoming Israel's first president, and David Ben Gurion's (head of the Jewish Agency) taking over as the state's first prime minister were not symbolic acts, but demonstrated the Zionist principle on governing of the state. Similarly, as noted in Encyclopedia Britannica (Vol.19, p.964). "It was in keeping with the Zionist principle that the Knesset proclaimed Jerusalem the capital of Israel (although only a section of the new city was actually held by Israel) and passed the law of Return, which gave every Jew the right to immigrate." Israel's overt political system and government function under WZO's directions. Elections and other political processes are meticulously maintained as a facade. Governmental charges are effected according the WZO's specific political aims. Yitazhak Rabin, enjoying at this stage the prominence of a prime-mover and an achiever of the so-called peace accords with Israel's adversaries, was thrown out of office as prime minister in 1977 on a frivolous charge that he had irregularly maintained a foreign currency account abroad! The real reason was that the WZO wanted the hard-liner Zionist nationalist Menachem Begin as Israel's prime minister for the approaching Camp David summit where Zbigniew Brzezinski as President Carter's national security advisor was to direct the proceedings. Begin's much-talked about stubbornness and brusquness was useful for putting psychological pressure on the Egyptian president, Anwar Sadat. The principal object, however, was to put in place the Begin-Brzezinski team to steer the negotiations to the Israeli interests. Both Begin and Brzezinski were Polish in origin, spoke the same dialect, were mutually intimate, and had been secretly briefed by the Zionist authorities on what was required.

The World Zionist Organization, whose real leadership the Zionist International Jewry remains under cover, is itself an unprecedented body. It has a world-wide organic network of thousands of branches and anxiliary bodies - over two thousand are operating in the United States alone - through which it keeps a tight control over the world's Jews and advances the global interests of Israel and Zionism. A fair idea of its aims and interests can be obtained from two of the most important public statements of the Zionist International Jewry. The first statement was spelled out at the First Zionist Congress, at Basle in August 1897, about which Alan Taylor said: "This Congress was to the Zionist Movement what the constitutional Convention was to the nascent United States"(35). At the end of the Congress an official programme was announced. Its principal resolution declared: "The aim of Zionism is to create for the Jewish people a home in Palestine secured by public law"(36). The objectives to be secured to fulfil this aim and the rest of the programme were: "(1) the promotion of Jewish colonization of Palestine; (2) the establishment of an organization to bind world Jewry by means of institutions in each country containing Jews (i.e. the WZO); (3) the strengthening of Jewish national sentiment (i.e. the ideology of Zionism) ; and (4) the acquisition of government consent to the attainment of the aim of Zionism" (which was initiated by Balfour Declaration) (37). The objectives identified in the first statement were secured by 1948

not true. Zionism is actually a secular and political movement.. The final misconception which needs to be clarified is the belief that Zionism is a democratic movement stemming from the Jewish masses and sustained by broad popular support. It would be more accurate to describe the Zionist phenomenon as directive populism"(29). 'Directive populism' is polite terminology for thrusting an idea on the masses and popularizing it by directed propaganda.'

Another scholar, Dr. Burton Thurston writes: "It must be patently clear that Zionism does not build from a religious foundation. This is not to say that there is any aversion to the use of religious sentiment to give emotional force to achieve Zionist goals"(30). The Zionist leadership found it highly profitable for their political aims, to exploit the religious emotionalism of the Jews. Since the establishment of Israel they have continued to use it but never allowing the Jewish religious notions to interfere with the anti-religion and anti-moral aims of Zionism and the strictly non-religious nature of the Israeli state. Thurston records: "After the declaration of independence, Ben-Gurion began systematically to eliminate any religious element from the state," and quotes Ben-Gurion: "I tried to keep religion out of government and out of politics. As far as the state is concerned we were successful. Israel is a secular state"(31). Describing how political Zionism brought forth its child - the Zionist state - Alan Taylor writes:

> "The founding of the state was neither religious nor spontaneous, but the result of careful planning and organized activity"(32). The Basle Congress also brought into existence the World Zionist Organization. The Organization was to serve as the government proper of a pre-natal Israel. An Action Committee was formed to deal with pressing issues and an Executive was created to serve as a permanent leadership which would guide policy. Thus in 1897, the aim and policies of political Zionism were established, and a governmental structure was brought into existence to seek attainment of the aim (of creating the Zionist state) through implementation of the policies".(33)

The pre-natal comprehensive governmental structure for the envisaged state of Israel was made more elaborate, and still more deceptive for outsiders to be aware of it, by creating a new powerful body, the Jewish Agency described by an authentic source as follows:

> ***"Jewish Agency is an international body representing the World Zionist Organization, created in 1929, with headquarters in Jerusalem. Zionists needed financial backing for their project of creating a Jewish national home in Palestine. The Jewish Agency became an external arm of the Zionists eliciting aid from non-Zionist Jews, overseeing the settlement of Jew immigrants in Palestine, and helping set up a Jewish economy. Jewish Agency also negotiated with the Palestine mandatory government and Great Britain and represented Jewish interests at the League of Nations. Upon the establishment of Israeli state in 1948, the agency devoted itself to problems of immigration, settlement, the youth, propaganda, and cultural education of Jews outside Israel. These functions were***

Implication of PLO Israel Accord on Arab Politics

TARIQ MAJEED
Commodore P.N. (Retd)

Characteristics of the State of Israel

Due to elaborate deception by certain quarters, and other reasons, the real nature and characteristics of the Israeli state are not understood by most people, with the result that analysts of Middle East affairs, or other matters in which Israel figures, are misled in their reasoning and conclusions. No state in the world resembles the state of Israel; not even Pakistan which is said to be similar to Israel as both were established on ideological basis. This marginal similarity, in essence, is mistaken. Israel had a functioning government, fifty years before the state came into existence. Israel was established on usurped land by forcibly expelling the native inhabitants, and surreptitiously infiltrating that land with millions of Jews from US, Europe and the Soviet Union.

The state was created, by the World Zionist Organization (WZO) under a methodical plan using strategies of mega-time, multi-layered deception, irresistible coercion, ruthless terror and secret machinations, and employing the services of the world's Jewish people by motivating and uniting them through the ideology of Zionism. Israel is not a Jewish but a Zionist state, and officially so. Zionism is a world apart from Judaism. Zionism is a political, secular racist movement, claiming a master-race status for Jews and subordinate status for all the other peoples, that subscribes to an anti-religion, anti-moral philosophy. It is necessary to offer some insight into this undermining ideology as well as into the extraordinary global organization that employs this ideology to not only command all the Jews but also enforce a global, political, economic and social order forcibly subjugating all the countries to a One-World Government under it.

"Zionism is a Jewish nationalist movement that has had as its goal the creation and support of a Jewish National Sate in Palestine. It originated in Eastern and Central Europe in the latter part of the 19th century"(27). Political scientists Hans Kohn states: "Political Zionism drew much of its inspiration from 19th century influences which either had nothing to do with Jewish traditions or was in many ways opposed to them"(28). Historian Alan R. Taylor stating the aims behind his scholarly work "Prelude to Israel," says: "A further aim is to dispel certain misconceptions. One of these is the notion that Zionism is a religious movement with religious goals. This is

BLESSINGS OF THE EVERLASTING PROPHETHOOD

The Prophethood of the Holy Prophet Muhammad (*Sall Allah-o-alaihi-wa-sallam*) remains as effective till the last day of this world as on the first day of his raising. The beneficence emanating from him comprises of his teachings which form the basis of religious knowledge. This knowledge generates faith and is subsequently translated into conduct. Alongwith these teachings he also radiated invisible blessings which cannot be described in words. These blessings charged the hearts of the believers with firm belief and enlightened them forever. Those who partook both from these teachings and the blessings were indeed perfect Muslims. They received this beneficence directly from the Holy Prophet (SAW) and therefore occupy a unique status in the whole Ummah. His teachings and his blessings would be preserved in their pristine purity till the end of this world. No Body has any right to change the code of permission and prohibition defined by him. Similarly, in the realm of faith, his is the final word.

Nowadays people demand every reference from the Quran, without appreciating the source through which it reached us. After all who told us that it was the Divine Word and who read it over to us ? In fact, Quran is the perception of the Divine revelation by the Holy Prophet (SAW) alone. No body else can claim that he ever heard the revelation or saw and recognised the angel Gabriel. The Holy Prophet (SAW) is the only one to certify that Quran is the Word of Allah and not his own. His explanation and interpretation of the Quran is known as Hadith. The Quran states: "Nor doth he speak of (his own) desire (53:3).

It asserts that the Holy Prophet (SAW) did not speak a single word through the whisper of his soul. His conversation was always based on Divine revelation. In the case of Quran, both the words and meanings were revealed by Allah, while the meanings of Hadith were inspired by Allah and verbalized by the Holy Prophet (SAW). This explanation has the approval of the Holy Prophet (SAW) himself. Therefore it is not correct to demand the reference of everything from the Quran. On the other hand, it is equally improper to interpret the Quran without reference to the Hadith. Only that meaning of the Book would be considered authentic which was given by the Holy Prophet (SAW) and adopted by his companions. On this subject, he is the final authority.

Just as the teachings of the Holy Prophet (SAW) still continue to benefit mankind, so do his blessings. In the past, when the blessings of the earlier prophets waned with the passage of time, the faith of their followers weakened and they renounced their religion. This necessitated the raising of a new prophet to illuminate the hearts of people once again with his blessings. The blessings of the Holy Prophet (SAW) would neither wane nor fade but stay for ever like his prophethood, because no new prophet would be raised after him. Therefore, when Prophet Jesus (Alaihi Salam) (who is a born prophet), returns to this world, he

would not preach his own prophethood but would follow the Holy Prophet Muhammad (SAW) and would also invite others to do the same. Till the return of Prophet Jesus (AS), the responsibility of preaching and preservation of Islam in its pristine purity has been entrusted to the aulia of this Ummah. Therefore, like his teachings, the blessings of the Holy Prophet (SAW) must also be and, in fact, have been preserved, from bosom to bosom, under a Divine arrangement. Just as one has to go to an institution or a scholar to learn his teachings, one has to similarly seek audience with a person carrying his blessings. But there ought to be a yardstick or a criterion to determine the genuineness of a particular institution or a person. The answer lies in the simple method of comparison of one's condition with those who received these blessings from the Holy Prophet (SAW) directly. His company completely reformed their lives, illuminated their hearts and infused in them love of the virtue and hatred for the vice.

These were the companions, the most pious group amongst the entire Ummah. Piety and companionship are synonymous. They stand at that acme of human excellence where all the virtues of a non companion pale into insignificance. They transmitted his blessings down the line and thus a chain of transmission survives in the Ummah till today and will so continue till the Doomsday. The company of any saint in that chain should produce a positive change within us. Not only our outward practical life be reformed but our innerself (heart) should also be so imbibed as to experience hatred for vice and love for the virtue. We should feel pleasure in doing good and if due to any human weakness we commit a sin, it should divest us of inner peace and tranquillity. Only that person, whose company, by Allah's grace, initiates such transformation would be a true saint. This indeed is the difference between a true and a psuedo saint. If one discovers an accomplished wali, one should stick to him like his shoe lace. The criterian, therefore, is neither the increase of wealth and status nor the attainment of other mundane benefits.

The universe and all its systems have been designed by Allah since antiquity. The total providence of every human being, encompassing all his wordly requirements, has also been divinely proportioned. No one can consume anybody else's providence nor can leave this world before completely consuming his own. Allah may increase some one's provisions to see if his wealth attenuates the clarity and strength of his relationship with his Provisioner. Similarly, He may straiten the provision of some one to see whether he returns to his Creator in adversity or seeks recourse to others. While He may alternate someone's condition between prosperity and adversity, His system is so perfect, smooth and flawless that it simply does not have any room for our suggestions. Human visitation to this world is ephemeral, whereas His system is operating since time immemorial and only He knows how long will it continue to function. It is the permanent, perfect system which affects the temporary visitor but not vice versa.

It is, therefore, incorrect to presume that we acquired wealth or health or wordly comforts in the company of Hadhrat (Rahmat Ullah Alaih). These

mundane benefits are of no consequence because Allah has given these to even those who do not believe in Him, His Prophet (SAW) and the aulia. They also enjoy the fruits of this life. So, it is not justified to identify truth with worldly gains. A retired captain from a nearby village renounced Islam and converted to Shiaism. Once, a friend of ours asked him the reason for this absurdity at the fag end of his life. He replied: "I won the local bodies election and became the chairman due to the blessings of my new religion". A passing by aged lady heard the dialogue and remarked:"You should have rather turned a Hindu, to succeed Indira Gandhi. If the flower of this world is the reward of religion, you should turn Hindu to deserve greater reward".

Wealth or comforts of this world are not the criteria of truth. The Holy Prophet (SAW) is reported to have said: "Had this world weighed equal to the wing of a gnat, Allah won't let a non-believer have a drop of water to drink. It carries no value with Him". All its comforts and miseries are temporary and momentary. But the states that descend from Allah on the hearts and the blessings which are acquired through the Holy Prophet (SAW) are everlasting and guarantee success both here and in the Hereafter. This should be viewed from two angles. First, we should identify the process of reformation initiated as a result of our association with any person, institution or school of thought. Secondly, if someone belongs to that category of people who do not get easily influenced, he should see others associated with that institution or person and look for any positive changes resulting from that association. If he finds that they are reformed but he himself remains unaffected, then he should critically analyze himself. Probably some of his failings preclude him from receiving those blessings. But if he finds no change in anyone, it is better to quit immediately. It will be sheer waste of time to continue an associated where sincerity of purpose, love of virtue and hatred for vice are missing. One has very little time, death is chasing every one born in this world. To die in search of truth entitles one to Allah's mercy because according to a Divine declaration anyone who migrates towards Allah will receive his reward whether he reaches the destination or dies enroute.

So first of all, one should purify one's intention and purpose. He must then set out in the cause of Allah and in search of truth and piety. The worldly comforts, if received, are insignificant byeproducts of this journey and should not be taken note of.The real valueable achievement is firm belief in the Divine Unity, the prophethood and life of the Hereafter. Practical life increasingly influenced by these beliefs will be an indication of the acquisition of blessings and beneficence from the Holy Prophet (SAW). One should not waste one's time with an association which does not lead to this achievement.

May Allah accept our humble efforts and grant us the capacity to be good and do good. Ameen.